# انتظار حسین کی افسانہ نگاری میں وجودی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)


مقالہ نگار:

**جویریہ کہکشاں**

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد


جولائی ۲۰۲۲ء

# انتظار حسین کی افسانہ نگاری میں وجودی عناصر کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

**جویریہ کہکشاں**

یہ مقالہ

**ایم فل اُردو**

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اُردو زبان وادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز،اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۲ء

# مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: انتظار حسین کی افسانہ نگاری میں وجودی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

پیش کار: جویریہ کہکشاں، رجسٹریشن نمبر، MPURD,F18.18747

## ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: (اردو زبان وادب)

**ڈاکٹر رخشندہ مراد**

_______________

نگران مقالہ

**ڈاکٹر جمیل اصغر جامی**

_______________

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

**پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان**

_______________

پرو ریکٹر اکیڈ مکس

تاریخ _______________

# اقرار نامہ

میں جویریہ کہکشاں حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

جویریہ کہکشاں

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۲ء

# فہرست ابواب


| صفحہ نمبر | عنوان |
|---|---|
| III | مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم |
| IV | اقرار نامہ |
| V | فہرست ابواب |
| VIII | Abstract |
| IX | اظہار تشکر |
| ۱ | باب اول: فلسفہ وجودیت و بنیادی مباحث |
| ۱ | الف۔ تمہید |
| ۱ | ۱۔ موضوع کا تعارف |
| ۱ | ۲۔ بیان مسئلہ |
| ۱ | ۳۔ مقاصد تحقیق |
| ۲ | ۴۔ تحقیقی سوالات |
| ۲ | ۵۔ نظری دائرہ کار |
| ۳ | ۶۔ تحقیقی طریقہ کار |
| ۳ | ۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق |
| ۳ | ۸۔ تحدید |
| ۴ | ۹۔ پس منظری مطالعہ |
| ۴ | ۱۰۔ تحقیق کی اہمیت |
| ۵ | ب۔ فلسفہ وجودیت |
| ۵ | ۱۔ معانی، تعریف، ادبی مفہوم |

| | | |
|---|---|---|
| ۲۔ | مغربی و مشرقی وجودیت | ۷ |
| ۳۔ | مذہبی و دہری وجودیت | ۱۳ |
| ۴۔ | مذہبی و دہری وجودیت | ۱۵ |
| ج۔ | اردو افسانہ اور وجودیت | ۱۷ |
| ۱۔ | سماجی پس منظر | ۱۷ |
| ۲۔ | سیاسی پس منظر | ۲۰ |
| ۳۔ | انتظار حسین کی افسانہ نگاری | ۲۱ |
| ۴۔ | انتظار حسین بطورِ افسانہ نگار | ۲۲ |
| | حوالہ جات | ۲۵ |
| باب دوم: | انتظار حسین کے افسانوں میں وجودیت کے منفی عناصر | ۲۷ |
| الف۔ | کرب | ۲۷ |
| ب۔ | موت | ۳۳ |
| ج۔ | مایوسی، اکتاہٹ | ۳۷ |
| د۔ | گھن، کراہت | ۴۱ |
| ہ۔ | گھن اور کراہت | ۴۷ |
| | حوالہ جات | ۵۲ |
| باب سوم: | انتظار حسین کے افسانوں میں وجودیت کے مثبت عناصر | ۵۴ |
| الف۔ | خودشناسی، آگہی ذات | ۵۴ |
| ب۔ | جوش عمل، جدوجہد | ۶۱ |
| ج۔ | حریت، تصور آزادی | ۶۵ |
| | حوالہ جات | ۶۹ |
| باب چہارم: | انتظار حسین کے افسانوں پر کافکائی وجودیت کے اثرات | ۷۰ |

| | | |
|---|---|---|
| | الف۔ کافکا کا افسانہ اور وجودیت | ۷۰ |
| | ب۔ انتظار حسین کے افسانوں پر کافکائی وجودیت کے اثرات | ۷۴ |
| | حوالہ جات | ۸۲ |
| باب پنجم: | ماحصل: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات، کتابیات | ۸۳ |
| | الف۔ مجموعی جائزہ | ۸۳ |
| | ب۔ نتائجِ تحقیق | ۸۶ |
| | ج۔ سفارشات | ۸۷ |
| | کتابیات | ۸۸ |

# ABSTRACT


**Title: A Research and Critical Study of the Existential Elements in Intezar Hussain's Fiction**

Intezar Hussain is a unique prose writer due his unique abstract, symbolic, mythological and allegorical style. He portrays external and internal problems in his writings of twentieth century's man. This research thesis is a critical study of the existential elements in his fictions. Existential philosophy was transmitted to our literature through the West, gaining immense popularity among our writers and poets in the nineteenth and twentieth centuries. Intezar Hussain accepted the effects of Kafkaism in his writings.

First chapter contains the basic discussions about the philosophy of existentialism in the light of various Western and Eastern thinkers. In addition, a brief overview of Intezar Hussain's fiction has been presented. The second chapter reveals the negative elements of existentialism in Intezar Hussain's fiction. After the partition in the nineteenth century, political, social and societal conditions and internal disturbances badly affected the entity of the individual. As a result, the individual suffered from various conditions at the internal level. These conditions include anguish, emptiness, fear of death, disgust and boredom. All these elements have been discussed in details.

Fourth chapter examines the effects of Kafka's writings on Intezar Hussain's fictions. Fifth chapter reviews on the philosophy of existentialism and existential elements in Intezar Hussain's fictions. At the end of the chapter, research findings and further recommendations have been presented in the light of research analysis.

# اظہار تشکر

سب تعریفیں اللہ رب العزت کے لیے جو قابلیت بھی دیتا ہے اور کامیابی بھی۔(بیشک) میں اپنے مقالے بعنوان "انتظار حسین کی افسانہ نگاری میں وجودی عناصر کا تحقیق و تنقیدی مطالعہ" کی تکمیل پر رب ذالجلال کے حضور کلمہ شکر ادا کرتی ہوں کہ جس کے خاص کرم اور عنایت کے بغیر یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اردو فکشن میں میری دلچسپی ایم کے زمانے سے ہے۔ لہذا تحقیقی موضوع کا انتخاب کرتے وقت میری اپنی ذاتی دلچسپی اور اس کے علاوہ میری ہر دلعزیز استانی، ڈاکٹر رخشندہ مراد کی سرپرستی میں انتظار حسین کے افسانوں کے حوالے سے کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ کویڈ۔۱۹ کی وجہ سے تحقیقی سرگرمیوں اور ماخذات کی تلاش تک رسائی انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ مگر خوش قسمتی سے استاد محترم ڈاکٹر رخشندہ مراد کی وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی اور رہنمائی نے ہمت اور حوصلہ بڑھائے رکھا۔ میں ان کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ ان کی ہمہ وقت موجودگی اور رہنمائی کی بدولت میں اپنا کام احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے اہل ہو سکی ہوں۔ بیشک ان کا مشفقانہ رویہ اور کھٹی میٹھی ڈانٹ ڈپٹ اسکالرز کی ہمت اور حوصلے کو جواں رکھنے کا ذریعہ ہے، وہ ایک اچھی استاد اور بہترین رہنما ہیں۔ اللہ ان کے علم میں مزید اضافہ کرے (آمین)

تحقیقی سفر بلاشبہ ایک کھٹن سفر ہے، اپنے اس سفر میں سب سے بہترین اور مضبوط سہارا میرے والد صاحب، والدہ محترمہ، میری بہنیں اور بھائی ہیں جن کی بے پناہ دعاؤں حوصلہ افزائی اور اعتماد کی بدولت اس سفر کو اختتام کی جانب لے جانے کے اہل ہو سکی ہوں۔ میرے والد صاحب اور بھائی عمیر جنھوں نے نہ صرف میرے تعلیمی اور ہاسٹل کے اخراجات پورے کیے بلکہ مجھے ایک ایسا تعلیمی ماحول فراہم کرنے کی کوشش کی جس میں میں اپنے تعلیمی سفر کو بآسانی جاری رکھ سکوں۔ ان سب کی دعائیں محبتیں اور شفقت میرے لیئے سرمایہ حیات ہیں۔ میری زندگی کی ہر کامیابی میرے والد صاحب کے نام کہ ان کی جانب سے دیے گئے اعتماد، محبت، شفقت اور رہنمائی کی وجہ سے میں آج ایم فل کی سطح تک پہنچ پائی ہوں۔ ان کے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اللہ میرے والد صاحب کو عمر بالخیر عطا کرے۔

مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں اپنے ہم جماعت تنزیلہ اشرف کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے نہ صرف وقتاً فوقتاً میری حوصلہ افزائی کی بلکہ مواد کی جمع آوری اور دیگر تکنیکی مسائل کو حل کرنے میں ہمہ وقت میرا ساتھ دیا۔اس اہم موقع پر اپنی دیرینہ سہیلوں میرال زبیر اور لیلیٰ خان کی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں اور حوصلے نے میری ہمت کو باندھے رکھا۔

اردو ڈیپارٹمنٹ نمل، میرے تمام اساتذہ کرام،ڈاکٹر عابد سیال عابد،ڈاکٹر سفیق انجم،ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر نعیم مظہر،ڈاکٹر صائمہ نذیر،ڈاکٹر ارشاد بیگم،ڈاکٹر نازیہ یونس اور خاص کر میری نگران مقالہ ڈاکٹر رخشندہ مراد کی دل و جان سے شکر گزار ہوں جنھوں نے ایم فل کے سفر کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بھرپور سرپرستی فرمائی۔اللہ رب العزت سب کا اقبال بلند کرے۔(آمین)

جویریہ کہکشاں

سکالر ایم۔فل اُردو

## باب اول:

# موضوع کا تعارف و بنیادی مباحث

## الف۔ تمہید:

### ا۔ موضوع کا تعارف

انتظار حسین اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب اور بدلتے لہجوں کے باعث پیش منظر کے افسانہ نگاروں کے لیے بہت بڑا چیلنج تھے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں داستانوی فضا،اس کی کردار نگاری،علامتی، تجریدی اور اساطیری اسلوب کو عصری تقاضوں کے تحت برتا ہے۔انہوں نے نہ صرف افسانہ نگاری میں نام اور مقام بنایا بلکہ ناول نگاری اور تنقید نگاری میں بھی اپنے منفرد اور اچھوتے اسلوب کے باعث ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ان کے یہاں ماضی پرستی،روایت میں پناہ کی تلاش،پچھتاوے، یادِماضی، کلاسیکت سے محبت اور وجود کی تلاش بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ مجوزہ تحقیق انتظار حسین کے افسانوں میں وجودی عناصر کے تحقیقی مطالعے پر مشتمل ہے۔

### ۲۔ بیان مسئلہ

انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں نئے اور منفرد اسالیب کو پیش کیا۔ مجوزہ تحقیقی و تنقیدی جائزے میں اس بات کا مطالعہ کیا جائے گا کہ انتظار حسین کے ہاں ادبی اصطلاح وجودیت کن صورتوں میں ملتی ہے،وجودی عناصر کی پیشکش کے عوامل کیا ہیں اور ان کے ہاں کافکائی تحریروں کے اثرات کس حد تک دیکھنے کو ملتے ہیں۔

### ۳۔ مقاصد تحقیق

i۔ ادبی اصطلاح "وجودیت" (EXISTENTIALISM) کی تفہیم کرنا

ii۔ انتظار حسین کے افسانوں کے موضوعات اور اسلوب پر وجودی عناصر کے اثرات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنا

iii۔ انتظار حسین کے افسانوں پر کافکائی وجودی عناصر کے اثرات کا مطالعہ اور جائزہ پیش کرنا

vi۔ مشرقی معاشرے میں وجودی عناصر کے تناسب کا مطالعہ کرنا

## ۴۔ تحقیقی سوالات

i۔ادبی اصطلاح "وجودیت" (EXISTENTIALISM) کی مغربی اور مشرقی فکری اساس کیاہے؟

ii۔ انتظار حسین کے افسانوں میں وجودی عناصر کے موضوعات کی انفرادی اور اجتماعی تناظر میں ماہیت و نوعیت کیاہے؟

iii۔ انتظار حسین کے افسانوں میں وجودی عناصر کی پیشکش کی وجوہات اور کارفرما عوامل کیاہیں؟

Iv۔ انتظار حسین کی تحریروں پر کافکائی وجودیت کے اثرات کی نوعیت کیاہے؟

## ۵۔ نظری دائرہ کار

زیرِ نظر تحقیق میں انتظار حسین کی افسانہ نگاری پر ادبی وتنقیدی اصطلاح'' وجودیت Existentialism" کے عناصر اور اثرات کا تحقیق و تنقیدی جائزہ لیا گیاہے۔اس تحقیق میں وجودیت کی مشرقی اور مغربی تفہیم کا عمیق تجزیہ کیا گیاہے۔ مغربی ادب میں وجودیت کے نمایاں علمبردار سورین کریگارڈ، سارتر، گبریل مارسل ہائیڈ گرمارٹن، کارل جیسپرز، اور کامیو، کے وجودی نظریات کا مطالعہ کیا گیاہے جبکہ مشرق میں محمد حسن عسکری،، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر بختیار حسین صدیقی، جاوید حسین قاضی، اور ڈاکٹر سلیم اختر کے وجودی نظریات کی روشنی میں وجودی عناصر کا تعین کیا گیاہے مثلاخودشناسی، جدوجہد، لایعنیت، اکتاہٹ، مایوسی، موت وغیرہ۔فریم ورک کے مطابق درج ذیل نکات مجوزہ تحقیق کام میں پیش نظر ہوں گے۔

ا۔ خودشناسی کی اہمیت

۲۔ انتخاب کی آزادی

۳۔ کرب، موت،

۴۔ معنویت اور لایعنیت

۵۔ دہریت اور مذہب

اس تحقیق میں وجودیت کے حوالے سے انتظار حسین کے افسانوں کے متن کا جائزہ لیا جائے گا۔جس میں دیکھا جائے گا کہ افسانوں میں موجود وجودی عناصر کی پیشکش کے پس پردہ کون کون سے سیاسی، سماجی اور معاشرتی واقعات ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مصنف کی سوچ پر اثرانداز ہوئے۔

## ٦۔ تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع انتظار حسین کے افسانوں میں وجودیت کے اثرات کا جائزہ ہے۔لہذا بنیادی ماخذات میں انتظار حسین کی کتابیں جبکہ ثانوی مآخذات میں انتظار حسین اور ان کے افسانوں سے متعلق چھپنے والی کتب، مضامین اور رسائل کا مطالعہ کیا گیا ہے، جن تک رسائی کے لیے لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ انٹرنیٹ سے بھی استفادہ لیا گیا ہے۔

## ٧۔ موضوع پر ماقبل تحقیق

جدید اردو افسانے میں انتظار حسین کا نام بنیادی اور اساسی اہمیت رکھتا ہے۔انتظار حسین کے فن و فکر کے حوالے سے متعدد ناقدین نے خامہ فرسائی کی۔ان کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے مقالات بھی لکھے گئے۔ "انتظار حسین کی افسانہ نگاری" کے عنوان سے ایم۔ے کی سطح پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں ماحولیات کی عکاسی کے حوالے سے ایم۔اے کی سطح پر حال ہی میں ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا گیا ہے۔تاہم انتظار حسین کے افسانوں میں موجود وجودی عناصر کے حوالے سے تاحال کوئی تحقیقی مقالہ تحریر نہیں کیا گیا۔

## ٨۔ تحدید

مجوزہ تحقیق انتظار حسین کے افسانوی مجموعوں (آخری آدمی اور شہر افسوس) میں موجود وجودی نقطہ نظر کے حامل افسانوں کے جائزے پر مشتمل ہے۔دونوں مجموعوں میں موجود تمام افسانے تحقیق میں شامل کیے گئے ہیں جو وجودیت سے متعلق ہیں۔

### ۹۔ پس منظری مطالعہ

پس منظر مطالعے کے طور پر وجودیت پر مبنی تمام کتب تراجم اور مضامین سے استفادہ کیا جائے گا۔اس کے علاوہ انتظار حسین کے افسانوں،ان کے اسلوب اور فن و فکر سے متعلق تنقیدی مضامین اور تنقیدی کتب، تجزیوں اور تبصروں کو بھی مد نظر رکھا جائے گا۔

### ۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

انتظار حسین کی افسانہ نگاری نے اردو افسانے کو جدید افسانہ نگاری کے فن سے روشناس کروایا،۱۹۶۰ء کی دہائی میں انتظار حسین نے اس وقت کے تمام حالات واقعات کو مختلف موضوعات کے حوالے سے اردو افسانے کا حصہ بنایا۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس منفرد ادیب کی تحریروں کے فکری،فنی،اور اسلوبیاتی سطح پر تجزیے کیے جائیں۔یہ مقالہ اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے۔

## ب۔ فلسفہ وجودیت

### ا۔ معانی، تعریف،،ادبی مفہوم

وجودیت کا لفظ وجود سے نکلا ہے "وجود "انگریزی لفظ "Existence" کے ہم معنی قرار دیا جاتا ہے مختلف لغات میں لفظ" وجود" کے لغوی معنی ہستی ،زندگی،موجود ہونا، ظاہر ہونا کے طور پر ملتے ہیں۔"علمی اردو لغت "میں وجود کے معنی زندگی،ہستی، جسم ،بدن،ذات،پیدائش، ظہور،مادہ اور جوہر مراد لئے گئے ہیں۔[۱] اسی طرح "قائد الغات:" میں لفظ وجود کی تفہیم اس طرح کی گئی ہے۔ظاہر ہونا، نمائش ، ظہور ،حیات، زندگی ،ہستی،پیدائش،جوہر،مادہ،وجو و پانا یا پکڑنا،ہستی میں آنا،ہست ہونا،ظہار ہونا،پیدا ہونا،وجود میں لانا پیدا کرنا، ظہور میں لانا۔[۲]

یہاں لفظ وجود کسی شے کے موجود ہونے سے مشروط ہے۔وجود سے مراد کسی بھی شے کا وجود ہو سکتا ہے ،مثلاً تمام ٹھوس اشیا، جن وانس،اور فرشتے وغیرہ۔مگر وجودیت پسندانہ فکر رکھنے والے تمام حضرات صرف ایک انسانی وجود کی بات کرتے ہیں۔حسن عسکری کے مطابق۔""وجود" سے مراد کسی طرح کا"وجود مطلق"نہیں بلکہ انسان کا"نفسی وجود"ہے۔[۳]

وجودیت کے لیے انگریزی لفظ ''Existentialism' استعمال ہوتا ہے۔ یہ باقاعدہ طور پر ایک اصطلاح ہے،اور انگریزی کے توسط سے اردو میں منتقل ہوئی جسے "وجودیت" کا نام دیا گیا۔ افتخار بیگ کے مطابق۔ 'Existentialism کی اصطلاح کا پہلا استعمال بریل مارسل،اور ژال پال سارتر نے کیا اور بعد ازاں دیگر فلسفیوں کے ہاں یہ اصطلاح باقاعدہ طور پر استعمال ہونے لگی۔ان دونوں فلسفیوں نے نے فرد کی موضوعیت،داخلیت اور فرد کے اثبات ذات پر زور دیا[۴]

یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس پر وجودیت کے فلسفے کی اساس قائم ہے۔ان فلسفیوں کے وجودی نظریات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجودیت کا فلسفہ بنیادی طور پر فرد کی انفرادیت اور آزادی انتخاب کا فلسفہ ہے۔ یہ فلسفہ ان تمام،روایتی فلسفوں کے خلاف رد عمل ہے جن کا فرد کی ذات اور اس کے مسائل سے دور تک واسطہ نہیں۔ ہے۔اس فلسفے کا بنیادی نعرہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات اور کائنات کی تمام اشیا سے افضل ترین ہے،انسان زندگی کی مشکل ترین ڈگر پر اپنے ہونے سے دستبردار نہیں ہو سکتا،بلکہ اپنی ذات کے اثبات کے لئے فرد کو ہمہ وقت کوشاں رہنا پڑھتا ہے۔امریکی فلاسفر Thomas Flynn کے مطابق:

> “Existentialism is a philosophy of freedom.Its basisis the fact that we can stand back from our lives andreflect on what we have been doing.in this sense,we are always ‘more’ than ourselves. But we are as responsible as we are free.”[5]

وجودیت کی تحریک معاشی و معاشرتی جبر اور دباؤ کو ختم کر کے فرد کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ آزادانہ فیصلہ اور انتخاب کے اہل ہو سکیں اس حوالے سے جرمن فلاسفر David E. Robert لکھتے ہیں:

> “This Movement fights against those intellectual and social forces which cripple, Stifle or destroy freedom. It reminds men of their most basic inner Problems and calls them

away from stifling abstractions and automatic conformity."[6]

وجودی فلسفے کا بنیادی نعرہ تصور حریت ہے۔اور یہ کہ انسان فطرتاً آزاد ہے مذہب یا معاشرے کی طرف سے فرد پر کسی قسم کی بندش مسلط نہیں کی گئی۔انسان کے پاس یہ اختیار موجود ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے لیے راہ رعمل کا انتخاب کر سکتا ہے۔بقول ڈاکٹر افتخار بیگ:

> "وجودیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس میں فرد کی انفرادیت اور استقامت پر زور دیا جاتا ہے اور وجودیت ایسی کیفیت ہے جو نہ صرف نقیض لا شے ہے بلکہ فرد کو زندگی کے دھارے میں منفرد اور ممتاز بناتی ہے اور اسے استقامتاً و استواریت سے متصف کرتی ہے۔[۷]

اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

> "وجودیت کی اساس اس امر پر استوار ہے کہ انسان اس دنیا میں آزاد اور منفرد پیدا ہوا، لیکن معاشرے میں رہنے کی بنا پر وہ اپنے لئے ایک خاص نوع کا طرز عمل منتخب کرنے پر مجبور ہے۔[۸]

ڈاکٹر سلیم اختر نے وجودیت کی جو تعریف کی اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ فرد کو معاشرے میں آزادی تو حاصل ہے لیکن ساتھ ہی انسانی زندگی کے لئے کچھ قوانین اور معیارات بھی طے کئے گئے ہیں جن کے مطابق فرد اپنے لیے زندگی کی مثبت راہوں کا انتخاب کر سکتا ہے۔ڈاکٹر خواجہ محمد سعید نے اپنے مضمون میں وجودیت کی تعریف اس طرح کی:

> "وجویت کیا ہے؟اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ جب ہم جذباتی کیفیات کی روشنی میں انسانی وجود کے معانی دریافت کرنے کے لئے فلسفیانہ کوشش کرتے ہیں تو اس کا نام وجودیت ہے۔وجودیت ایک فکری تحریک ہے اور اس تحریک میں انسانی وجود کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔[۹]

درج بالا تعریفوں کو دیکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وجودیت کا فلسفہ اثبات ذات کا فلسفہ ہے۔یہ فلسفہ فرد اور فرد کی زندگی کو ایک مخصوص صورت حال کے مطابق جانچتا اور پرکھتا ہے۔اس فلسفے کے متعلق مختلف وجودیت پسندوں کے ہاں مختلف نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وجودیت کی کوئی مخصوص اور جامع

تعریف ممکن نہیں،البتہ تمام وجودی فلاسفروں کے ہاں انسانی وجود اس کی آزادی اور اسکی ہستی کی استواریت کے حوالے سے جدوجہد ان سب کو ایک مرکزی نقطے پر اکھٹا کرتی ہے کہ وجود ذات تمام اشیا پر مقدم ہے۔ ذیل میں وجودیت کے مشرقی اور مغربی دبستانوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

## ۲۔ مغربی و مشرقی وجودیت

اٹھارہویں صدی میں سیاسی و سماجی ابتری،،انتشار اور بے اطمینانی نے نہ صرف خارج بلکہ داخل کی دنیا کو شدید طور پر متاثر کیا۔ وجودیت کے نعرے کی گونج اٹھارہویں صدی میں یورپ میں ہونے والی سیاسی و سماجی بدحالی کے نتیجے میں سنائی دی جانے لگی۔ انقلاب فرانس، پہلی اور دوسری جنگ عظیم، سائنسی ترقی اور یورپ میں مذہب اور عقیدے کا زوال اس فلسفے کو پروان چڑھانے کا اہم ترین محرک ہیں۔ وجودی فلسفے کے متعلق اب تک بہت سے محققین نے قلم اٹھایا ہے۔ وجودی فلسفے کی تفہیم اور اس کے آغاز و ارتقا نیز اس فلسفے کے انسانی زندگی اور مشرقی و مغربی ادب پر اثرات کی نوعیت کو جاننے اور سمجھنے کے لئے سارتر کے مظامین جن کا ترجمہ قاضی جاوید نے " وجودیت اور انسان دوستی" کے نام سے کیا ہے اس کے علاوہ، قاضی جاوید کی کتاب "وجودیت" علی عباس جلال پوری کی کتاب "روایات فلسفہ " جمیل جالبی کی کتاب "تنقید اور تجزیہ " ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "اردو ادب کی تحریکیں "اس کے علاوہ محمد حسن عسکری، پروفیسر بختیار حسین صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر افتخار بیگ اور ظفر احمد صدیقی کے افکار و نظریات کو بنیادی ماخذات کی حیثیت حاصل رہی۔ مندرجہ بالا محققین کے افکار و نظریات کی روشنی میں مغرب اور مشرق میں وجودی فلسفے کے آغاز اور ارتقا کے متعلق بحث درج ذیل ہے۔

وجودیت کے علمبرداروں میں سورین کریگارڈ (وجودیت کا بانی)، ہائیڈ گر، مارسل، سارتر، کافکا، کامیو کا نام بنیادی طور پر شامل ہیں۔ ان تمام مفکروں کے افکار و میلانات میں مختلف قسم کے اختلافات موجود ہیں، تاہم افکار کی کڑی ایک ہی نقطہ نظر "انسانی وجود" پر جا ٹھہرتی ہے۔۔ یہ تمام مفکر اپنی فکر کے مطابق انسانی ذات کو ایک الگ شناخت دیتے ہیں۔

مغرب میں اس فلسفے کی تفہیم میں متعلقہ عہد کے سیاسی، معاشرتی، سماجی، تہذیبی۔ اخلاقی منظر نامے معاون ثابت ہوئے۔ اس فلسفے کا باقاعدہ آغاز انقلاب فرانس سے ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور پھر اس کے بعد پہلی و دوسری جنگ عظیم اور پھر سائنسی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات نے اس فلسفے کو خام مواد فراہم کیا۔

انقلاب فرانس نے عوام کی فکر و نظر کے آئینے کو کو بدل کر رکھ دیا۔ جہاں انسان کو ہر طرح کی سہولیات میسر ہوئیں وہیں انسان کے داخل میں بے چینی بڑھتی چلی گئی، مشینوں کی آوازوں میں انسانی آوازیں دبتی چلی گئی۔ انسان آہستہ آہستہ تنہائی، کرب، اور مایوسی کا شکار ہوتا چلا گیا۔ انسان نے دیہاتوں سے شہروں کا رخ کیا تو اپنے اصل سے الگ ہو گیا۔ خاندانی نظام درہم برہم ہو گیا۔ تعقل پسندی نے مذہب اور اقدار جو انسان کا واحد اور آخری سہارا تھیں، کو گہری ضرب لگائی۔ ذہنی امراض اور خودکشیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ یہی وہ دور تھا جس میں انسان کی شناخت کے متعلق سوال اٹھائے جانے لگے، مذہب کی طفل تسلیاں انسان کے لئے ناکارہ ثابت ہونے لگی۔ معاشرے کا مروجہ نظام فرد کی انفرادیت کا قاتل ثابت ہوا۔ یہ وہ وجوہات تھیں جنھوں نے فلسفہ وجودیت کو خام مواد فراہم کیا۔ اس فلسفے کو امتیازی مقام بیسویں صدی میں حاصل ہوا۔ اس صدی میں ہونے والی پے درپے دو عالمی جنگوں نے انسانی ذات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کے نتیجے میں انسان اعتماد ذات سے محروم ہوتا چلا گیا۔ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ جنگ میں یوں ہی لاکھوں مرنے والوں کی ذات کا اصل حوالہ کیا ہے؟ یوں ہی مر جانا انسان کا مقدر ٹھہرا ہے تو پھر زندگی کا مقصد کیا ہے؟ افتخار بیگ اپنے مقالے اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات میں لکھتے ہیں:

> "سابقہ صدیوں کا یہی خلفشار، بے چینی، اضطراب، جنگوں کی تباہ کاریاں موت کی ارزانی، جبر و استبداد آمریت، بار بار کی بغاوتیں، عقائد اور روحانی اقدار کا زوال، مذہب کے نام پر ہونے والا کشت و خون سائنس و صنعت کی ترقی اور زندگی میں در آنے والے میکانکی رویے، فرد کے لئے بے حد اذیت ناک ثابت ہوئے۔ اور نتیجتاً فرد اپنے موضوع کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو۔ اپنے موضوع کی طرف یہی مراجعت وجودیت کے فلسفے کا جواز بنی۔ (۱۰)

انیسویں او بیسویں صدی میں مذہب اور عقیدے کے زوال عوام کے اندر بے چینی اور انتشار پھیلانے کا سبب بنا۔ نتیجتاً ماحول میں کرب و اضطراب اور بے چینی کی فضا پھیل گئی، پریشانیاں بڑھنے لگی جن کا صد باب کسی صورت ممکن نہیں تھا۔

اس ساری صورتحال کے بعد فرد اپنے داخل میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ وجودی فلاسفروں نے فرد کے داخل اور فرد کے داخل کو اہمیت دے کر فرد کو اثبات ذات سے روشناس کروایا۔ عوام نے ان وجودی مفکروں کے نظریات کا گہرا اثر قبول کیا۔ وجودیت کے فلسفے کا باقاعدہ آغاز جرمن فلسفی سورین کریگارڈ کے افکار و خیالات سے ہوتا ہے۔ کریگارڈ کے افکار و نظریات نے بیسویں صدی کے افق پر ایک ہلچل پیدا کر دی۔ دیگر جرمن فلسفیوں نے کریگارد کے نظریات کو تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ قبول کیا، البتہ تمام وجودی فلاسفر فرد کی انفرادیت اور اثبات ذات کے قائل ہیں۔ لیکن فکر میں تنوع موجود ہے۔ مقالے کے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذیل میں مغربی فلسفیوں کے افکار و نظریات کا اجمالا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

## سورین کریگارڈ

سورین کریگارڈ جسے وجودیت کا بانی مانا جاتا ہے "کریگارڈ کے فلسفے کا مرکزی نقطہ معروض کی نفی اور موضوع کا اثبات ہے۔" اس کے نزدیک انسان دنیا میں پہلے آتا ہے پھر حالات کے مطابق وہ اپنے لیئے زندگی کے دھارے بناتا چلا جاتا ہے۔ پہلے سے طے شدہ کچھ بھی نہیں ہوتا، وہ موضوعیت کو ہی اصل سچائی مانتا ہے اس کے نزدیک آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور وہ اپنی مرضی سے اپنی تقدیر کو بدلنے کا اختیار رکھتا ہے قاضی جاوید نے اپنی کتاب "وجودیت میں کریگارڈ کے نظریات قلمبند کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "کریگارڈ نے اپنے نظریے کا اطلاق عیسائیت پھر رکھتے ہوئے کیا کہ کوئی بھی انسان پیدائشی عیسائی نہیں ہوتا بلکہ بنایا جاتا ہے۔ وہ آزادی انتخاب کی بات کرتا ہے اور یہ انسانی عقل پر منحصر ہے کہ وہ گناہ و ثواب میں سے کس کا انتخاب کرتا ہے۔ کریگارڈ حد سے بڑھی ہوئی عقلیت کی مخالفت کرتا ہے۔ انسان کو جو بھی فیصلہ کرنا ہے اپنی ذات کے لیئے کرنا ہے اس سلسلے میں کوئی مذہب، سماج، روایت، یا قانون رہنمائی نہیں کر سکتا۔"[۱۱]

کریگارڈ انتخاب اور اختیار کی آزادی کے ساتھ ساتھ جبر اور استبدادی قوتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ کریگارڈ اپنے افکار و خیالات میں خوف، دہشت، تنہائی، تشویش اور انتخاب کا ذکر کرتا ہے جو وجودیت کے اہم ترین عناصر ہیں۔

## ژال پال سارتر

مغرب میں وجودیت کے حوالے سے سب سے بڑا نام ژال پال سارتر کا ہے۔سارتر اپنی تحریروں میں تاریخی جبریت،نفسیاتی دباؤ،سیاسی استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے آزادی کے اثبات کااعلان کرتا ہے۔سارتر کا یہ بیان وجودیت کے وسیع تر معنی بیان کرتا ہے:

"کبھی بھی ہم اتنے آزاد نہیں تھے،جتنے ہم جرمنوں کے تسلط کے دوران ہوئے،ہمیں تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا،ہمیں بات کرنے کا حق میسر نہ تھا،ہر روز ہماری توہین کی جاتی اور سب کچھ چپ چاپ سہنا پڑتا،ہمارے گروہ کے گروہ مزدوری یہودیت اور سیاست کے نام پر جلاوطن کیے گئے۔اشتہار،اخبار،اعلانات،سینما ہماری بے رنگ اور گھناؤنی زندگی کی تصویر پیش کرتے۔اہل جبر چاہتے کہ ہم اسے قبول کریں،یہی وجہ تھی کہ ان حالات میں ہم آزاد تھے کیونکہ ہم اپنے صحیح خیال ہی کو فتح مندی سمجھتے،زباں بندی کے سبب ہمارا ہر لفظ اعلان تھا،ہمارا ہر اشارہ ایک ذمہ دارانہ وابستگی کا اعلان تھا،ان صبر آزما حالات میں ہم نے اپنی موجودگی(existence) کو پرجوش اور پرعزم بنایا۔"[۱۲]

سارتر کے نزدیک وجودیت ایک ایسا فلسفہ ہے جو انسانی زندگی کو ممکن بناتا ہے۔سارتر کے نظریے کا بنیادی نقطہ "وجود جوہر پر مقدم ہے۔"existence precedes essence`` یعنی وجود جوہر پر مقدم ہے۔یعنی انسان کا وجود پہلے ہے اور وہ جو کچھ بنتا ہے اپنے وجود میں آنے کے بعد بنتا ہے۔

سارتر کی وجودیت میں آزادی انتخاب اور عزم وارادہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے،وہ کہتا ہے جب انسان جب جھوٹ مکروفریب،جرائم،گناہ اور موت کے غالب احساس سے شدید کرب اور مایوسی کا شکار ہوتا ہے تو یہیں سے انسان اپنے لئے زندگی کے صحیح اور درست دھارے کا انتخاب کرتا ہے۔انسان کا اپنا شعور اسے صحیح اور غلط کی جانب لے کر جاتا ہے۔ڈاکٹر عبدالخالق نے "وجودیت اور انسان دوستی" کے دیباچے میں سارتر کے وجودی خیالات کچھ اس طرح بیان کئے ہیں:

"سارتر نے اس الزام کی بھی تردید کی ہے کہ وجودی فلسفہ ایک قنوطی رجحان ہے ،بلکہ وجودی فلسفہ انسان کو جوش عمل پر اکساتا ہے،اس کے اندر احساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے

جس کے بل بوتے پر وہ حرکت عمل کے لیے آمادہ ہوتا ہے، اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لئے فیصلہ اور قانون سازی کرتا ہے۔(۱۳)

## ہائیڈ گرمارٹن

ہائیڈ گر بذات خود وجودی ہونے کے منافی ہے۔ لیکن اپنے افکار و خیالات کی بدولت ہائیڈ گر کا نام بیسویں صدی کے نمائندہ فلسفیوں شمار کیا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہائیڈ گر کے افکار و خیالات کا بنیادی نقطہ ہی "ہستی" ہے وہ اپنی کتاب "being and time" میں ہستی کے متعلق بے شمار سوالات اٹھاتا ہے مثلاً وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے۔؟ اسکی ہستی کہاں سے وابستہ ہے؟ وہ بیک وقت ماضی حال اور مستقبل سے متصادم ہوتا ہوا تاریخی تسلسل میں ہستی کو تلاش کرتا ہے۔ قاضی جاوید ہائیڈ گر کے فلسفیانہ خیالات کو قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہائیڈ گر کے نقطہ نظر سے انسان ایک ایسا وجود ہے، جو دنیا میں پھینکا گیا ہے۔ ہمیں اس جہاں میں ہماری رضا، ہمارے مشورے ہمارے علم کے بغیر پھینک دیا گیا ہے ہمیں معلام نہیں کہ ہم کہاں سے اور کیوں آئے ہیں۔؟ ہمیں بار زیست بہ مجبوری اٹھانا ہے۔پھت بھی اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش ناپسندیدہ ہے۔اس لیے گو ذرائع نجات موجود ہیں اور ہم بوجھ بھی رضامندی کے ساتھ اٹھائے ہوئے ہیں، لیکن اگر ہم اس سے بچنے کی کوشش کریں ،زندگی کے حقائق اور مقتضیات سے منہ پھیر لیں تو یہ نقلی زیست کی راہ ہو گی، ہمیں زندگی کو ایک دعوت مبارزت کی حیثیت سے قبول کرنا ہے، دنیا کو حقیقی طور پر اپنانا ہے۔(۱۴)

ہائیڈ گر کے نزدیک انسان کا ماضی حال اور مستقبل دکھ سے لبریز ہے، انسانی زندگی موجب آزار ہے، لیکن دکھ سے نجات ممکن ہے، ایسا تبھی ہو سکتا ہے جب انسان زندگی کے تمام حقائق کو تسلیم کرے۔

## گبریل مارسل

مارسل بھی ہائید گر کی طرح خود کو وجودی کہلانے سے انکاری ہے تاہم اسکی تمام تر تخلیقی کاوشیں اسے ایک بنیادی وجودی مفکر ثابت کرتی ہیں۔اس کی تمام تحریریں اسی ایک اساسی نقطے کے گرد گھومتی ہیں کہ انسان اس کائینات میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختیار ہے۔وہ کریگارڈ کی طرح عقلیت کو شدید طور پر نشانہ بناتا ہے اور کہتا ہے کہ عقلیت انسان کی آزادی کو ختم کر کے اسے اجتماعیت میں پھنسانے کا ایک پھندہ ہے۔ یہ معاشرے میں بدامنی کو پھیلا

کر جبر و استحصال پیدا کرنے کا سبب ہے۔ یہاں یہ کہنا غلط نا ہو گا کہ کریگارڈ اور مارسل کے نظریات میں مماثلت ہے ہے کیونکہ دونوں ہی معاشرے میں پھیلتی ہوئی بدامنی کا حل خدا اور مذہب کی عقیدت میں تلاش کرتے ہیں اور شخصی انفرادیت کے قائل ہیں۔ انسان کے داخلی کرب، انتشار اور لایعنیت کو موضوع بناتے ہیں۔

## کارل جیسپرز

کارل جیسپرز کا نام بیسویں صدی کے عظیم ماہر نفسیات اور وجودی فلاسفروں میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ کارل بھی دیگر وجودی مفکروں کی طرح انسان کی طرح داخلی اور خارجی سطح پر انسانی آزادہی کا خواہاں ہے۔ کارل جیسپرز کا یہ بیان:

> "No choice without decision, no decision without will, no will without duty, no duty without being"(15)

اس کے وجودی ہونے کی دلیل ہے

## البرٹ کامیو

البرٹ کامیو وجودی روایت کا نمائندہ ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے کامیوں لغویت، تنہائی اور افسردگی کے زیر اثر زندگی بسر کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی تحریروں میں لغویت کے شدید احساس کا پرچار کیا ہے۔۔اس کے نزدیک:

> "دنیا لغو ہے، کوئی شے یہاں تک کہ انسان بھی کسی مفہوم کا حامل نہیں۔ کائنات موضوع کی سٹیٹ ہے۔ واحد سنجیدہ فلسفیانہ مسئلہ خودکشی کا مسئلہ ہے انسان بنیادی طور پر لغو حالتوں میں زندگی بسر کرتا ہے، اور ان پر قابو پانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ مگر اس کی تمام سرگرمیاں لاحاصل اور لایعنی ہیں۔"(۱۶)

لغویت کے اس احساس کو اجاگر کرتے ہوئے کامیو نے سسی فس کی مثال پیش کی ہے، دیوتاؤں کی جانب سے دی جانے والی سزا میں سسی فس مہیب چٹانوں کو پہاڑوں پر لے کر جاتا ہے، پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے ہی چٹانیں گہرائی میں لڑھک جاتی ہیں، منزل مقصود تک جانے کے لئے وہ بار بار یہی عمل دھراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان بھی

سسی فس کی طرح ساری زندگی لاحاصل کی تگ ودو میں زندگی گزار دیتا ہے۔تاہم کامیو نے زندگی کے آخری آیام میں لغویت کے اس احساس کو مثبت دھارے کی طرف موڑ دیا۔اس کا یہ کہنا کہ انسان ایسی صورتحال میں فتح وشکست کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہمت ، جرات اور بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے، مثلا جابر قوتوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، متذکرہ بنیادی فلسفیوں کے علاوہ وجودیت کے علمبرداروں میں نطشے کولن ولسن، ہزل، کارل بارتھ، مارلوپونٹی اور سیمون ڈی بوار کے نام شامل ہیں اور تمام کی فکر کا مرکزی نقطہ انسانی وجود اور تصور حریت ہے۔

## ۳۔ مشرقی وجودیت

دیگر تمام فلسفوں اور تحریکوں کی طرح وجودی نعرے کی گونج مشرق میں بھی سنائی دینے لگی۔ مشرق میں وجودیت کی مقبولیت کا سبب وہ تمام وجوہات تھیں جو ۱۹۴۷ کی اکھاڑ بچھاڑ کے دوران اور بعد میں نمودار ہوئی۔ تقسیم ہند اور پھر ہجرت کے دل دہلا دینے والے خوں ریز واقعات اور پھر پے درپے ہونے والے مارشل لانے ادبی افق کو شدید طور پر متاثر کیا، یورپ میں ہونے والی دو عظیم جنگوں نے جس طرح فرانس کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو ایک ناختم ہونے والے عفریت سے دوچار کیا، اسی صورتحال سے ہندوستان دوچار ہوا۔

تقسیم اور پھر ہجرت کے کرب سے انسان دوچار ہوا، دواران ہجرت انسانی زندگی کی دھجیاں بکھیر کرر کھ دی گئی، گھر بار، جائیدادیں محبتیں اور عصمتیں لٹ گئی۔خون ریزی میں انسان سے اس کے اپنے چھین لیئے گئے، اور بچ جانے والے ساری زندگی اپنی ذات کے لاشے اکٹھے کرتے رہے۔انگریز کا قائم کردہ نظام ابھی تک برقرار تھا، مذہب، زبان، تعلیم اور معاشرت پر مغربیت حاوی تھی۔لبوں پر جبری قفل تھے۔ معاشی بحران کا غلبہ تھا۔ایسی صورتحال میں انسان ایک ناختم ہونے والی اذیت اور کرب سے دوچار ہوااور لایعنیت کے شدید احساس سے دوچار ہوا۔ یہ وہ تمام بنیادی عوامل تھے جو مشرق میں وجودی افکار وخیالات کو پروان چڑھانے کا سبب بنے۔

مشرق میں ۷۰ کی دہائی تک ہمارے دانشور اور تنقید نگار وجودیت کی مختلف بحثوں میں الجھے رہے تاہم مشرقی وجودیت پسندوں نے دہری وجودی رویے کو ناپسند کرتے ہوئے اس کا رشتہ تصوف کے ساتھ جوڑنے کی سعی کی۔اور اسے تعمیر ذات اور عرفان ذات کا فلسفہ قرار دیا ہے۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> "وجودیوں کے ہاں جو یاسیت نظر آتی ہے، دراصل وہ انہیں عمل کی طرف لے جاتی ہے۔وہ نفی کے ذریعہ اثبات ذات کی طرف بڑھتے ہیں۔ دل سے اٹھا جلوہ ہائے معانی غیر گل آئینہ

بہار نہیں ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان اپنی ذات کا عرفان حاصل کرتا ہے، اپنے فیصلے سے اپنے کرب کو دور کرتا ہے جہاں وہ امکانات کو پہچانتا ہے اور انتخاب کرنا سیکھتا ہے۔ جہاں اسے اپنی عظمت کا احساس کرنے اور کرانے کے لئے عمل کرنا پڑتا ہے۔"(۱۷)

حسن عسکری جنھوں نے اپنے مضامین اور افسانوں میں جدید مغربی رجحانات کو متعارف کروایا۔ وجودی فلسفے کے متعلق ان لکھتے ہیں:

"ان فلسفوں میں سب سے نمایاں "وجود پرستی"Existentialism ہے۔ یہاں وجود سے مراد کسی طرح کا "وجود مطلق" نہیں بلکہ انسان کا "نفسی وجود" ہے۔(۱۸)

زندگی کی مہملیت کے حوالے سے وہ یوں گویا ہیں:

"انسانی زندگی کی مہملیت کے حوالے سے وجود پرستی" کے فلسفے نے ایک اور تصور دنیا میں پھیلایا ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کے جتنے مظاہر ہیں وہ "مہمل" ہیں۔ بحر حال زندگی کو اسی رنگ میں قبول کرنا چاہیے، اور بحر حال زندگی کو اسی رنگ میں قبول کرنا چاہیے، اور زندگی کی مہملیت کو قبول کرکے ہی انسان اپنا وجود دریافت کر سکتا ہے۔(۱۹)

پروفیسر بختیار حسین صدیقی کے وجودی فلسفے سے متعلق مقالات جو جاوید اقبال کی مرتب کردہ کتاب "وجودیت" میں شامل ہیں۔ ان مقالات میں بختیار حسین صدیقی نے انسانی وجود اور مظہریت سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اپنے مقالے "وجودیت کیا ہے" میں وجودی فلسفہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"وجودیت وہ طرز فکر ہے جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلوؤں کی بجائے جذبی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ عقل تجربہ اور کلیت کے چکر میں پھنس کر دور ہی سے حقیقت کو ہاتھ لگا کر نکل جاتی ہے۔ لیکن جذبہ وجود کے اندر گھس کر ہمیں دل کی گہرائیوں کا پتا دیتا ہے۔۔۔۔ وہ ان مسائل پر روشنی ڈالتی ہے جن کا تعلق براہ راست انسان کی منزل مقصود سے ہوتا ہے۔"(۲۰)

دیکھا جائے تو تمام مشرقی مفکروں کے نزدیک بھی وجودیت کا فلسفہ انسانی ذات کی تفہیم و تشریح کا فلسفہ ہے، اور یہ تمام فلسفی گھوم پھر کر صرف ایک ہی مرکز پر آکر ٹھہر جاتے ہیں اور وہ مرکز ہے انسانی وجود اور اس سے متعلق مسائل۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"وجودیت جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں تو یہ بنیادی طور پر فرد کا فلسفہ ہے۔اور ہر وہ شخص،ادیب دانش ور جو اپنی زندگی کی میں بے معنویت یاسیت عدم تحفظ کا شکار ہو اس کے لیے اس تصور میں خاص کشش ہے، شاید یہ عدم تحفظ اور یاس پرستی کے رجحانات کو تو ختم نہ کرسکے لیکن اتنا یقینی ہے کہ ان کی تفہیم ہو جاتی ہے۔"(۲۱)

ہمارے یہاں دانشوروں، تنقید نگاروں، فلسفیوں اور ادیبوں نے نے وجودیت کے منفی اور مثبت رویے کو اس وقت کی متعلقہ صورت حال کے تابع سمجھ کر قبول کیا۔اور یہ فلسفہ ہمارے اب تک کے ادانشوروں کی بحث کا حصہ ہے۔ کچھ تنقید نگاروں نے اس کی تائید کی اور کچھ نے تردید۔ ان میں سے بیشتر ادیب سارتر کی آزادی سے خائف نظر آتے ہیں اور سارتر کے خدا کے انکار کی شدید مخالفت کی اور اس فلسفے کی تعبیر و تشریح اسلامی فلسفے کی رو سے کی۔تاہم ان تمام مباحث کے ساتھ ساتھ وجودی فلسفے نے اردو ادب میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ شاعری اور فکشن میں وجودی فکر نے موضوعات کو تنوع عطا کیا۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے انسانی زندگی کی داخلی اور خارجی صورتحال کو خوش اسلوبی سے پیش کیا۔

## ۴۔ مذہبی و دہری وجودیت

وجودیت کوئی متعینہ فکر نہیں، بلکہ اس فلسفے کے حوالے سے متخالف و متغائر افکار و نظریات موجود ہیں۔اور اس کے نقطہ آغاز سے اب تک ناقدین ادب مختلف قسم کی بحثوں میں الجھے رہے۔وجودی فکر کے دو دبستان (School of Thoughts) ہیں۔

ا۔مذہبی وجودیت (کیتھولک نظریہ)

۲۔دوہری وجودیت

### مذہبی وجودیت

اس مکتبہ فکر کے ماننے والے خدا کے وجود کے قائل ہیں۔وہ اس نظرے کی تردید کرتے ہیں کہ وجود جوہر سے مقدم ہے۔ان کا ماننا ہے کہ انسان کا وجود لازمی طور پر کسی اور شے کے ساتھ وابستہ ہے جس نے انسان کو شعور سے وابستہ کیا اور وہ شعور خدا کا شعور ہے۔اور یہ کہ انسانی وجود کے اثبات کا زریعہ خدا کی ذات ہے۔ سورین کریگارڈ جو

وجودی فکر کا بانی ہے،اور الہیاتی وجودیت کا قائل ہے۔اپنی فکر میں خدااور انسان کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔اور خدا کے وجود کو بغیر کسی بحث کے قبول کرتا ہے۔بقول قاضی جاوید:

"اس نے کسی بھی جگہ وجود باری تعالی کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ،بلکہ وہ تو مدعی ہے کہ خدا کا وجود ثابت کرنے کی سعی اس کی توہین کے مترادف ہے اسی لیے وہ حضرت عیسیٰ کے خدا کو بلا چون چرا مان لیتا ہے۔اس کے نزدیک خدا ابدیت، لامحدودیت اور مطلقیت کے مساوی ہے۔"(۲۲)

مذہبی وجودیوں میں مارسل، کارل جیسپرز، یاسپرس اور مارٹن ببر کریکگارڈ کے خوشہ چیں ہیں۔مارسل کے نزدیک خدا ایک موضوعی کیفیت کا نام ہے۔وہ خدا کو کوئی شے کہنے کے سخت خلاف ہے کیونکہ خدا خاص قسم کی خصوصیات کا حامل ہے۔جبکہ جیسپرز بھی کریگارڈ کی طرح خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی مخالفت کرتا ہے۔

مارٹن ببر " خدا کی ذات کو ہمہ وقت حاضر و ناظر مانتا ہے۔اس کے نزدیک خالق اور مخلوق کا رشتہ لازم و ملزوم ہے۔وہ کہتا ہے کہ خدا کا وجود ہے تو انسانی وجود کا ثبات ممکن ہے۔۔اگر دیکھا جائے تو ان تمام فلاسفروں کے نظریات اسلامی تصوف کے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ہستی میں گم ہو کر عرفان ذات حاصل کرنا، خدا کی وحدانیت کا اقرار انسان اور انسانی عظمت کا تقاضا ہے۔مذہبی وجودیت پسندوں کا یہی رویہ اس فلسفے کا مثبت پہلو ہے۔ اسی مثبت روئے کو ہمارے فلسفیوں اور ادیبوں نے ادب میں جگہ دی۔اور سارتر کے بے جا آزادی کے رویے کی مخالفت کی۔

## دہری وجودیت

دوہری وجودیت کے نمائندوں میں سارتر، نٹشے، ہائیڈ گر دوستو فسکی سارتر اور کامیو کا نام سرفہرست ہے۔انیسویں صدی میں مذہب اور عقیدے کا زوال یورپ کی تاریخ کا ایک تلخ المیہ ہے۔اس عہد کی سیاسی سماجی ،معاشی اور مذہبی صورتحال نے عوام کو مذہب سے دلبرداشتہ کر دیا۔رہی سہی کسر نام نہاد پادریوں نے پوری کر دی جو نہ صرف خود گمراہ تھے بلکہ عوام کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور جب چاہتے عوام کو اپنی انگلیوں پر نچاتے۔مذہب اور عقیدے کے زوال نے خدا کو بھی انسان کی نظروں میں مشکوک کر دیا۔نٹشے نے تو یہ تک اعلان کر دیا کہ "خدا مر چکا ہے"وہ خدا جو فاسق و فاجر کو سزا نہیں دے سکتا وہ زندہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یا پھر وہ خدا جو مظلوموں کی مدد نہیں

کر سکتا۔ مصیبت زدوں کی چیخ وپکار نہیں سن سکتا، زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکتا وہ خدا زندہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہائیڈ گر بذات خود خدا کا انکار نہیں کرتا لیکن اس کے ہاں انسانی وجود اور اس کی آزادی کا اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ خدا کا موجود ہونا یا نہ ہونا غیر اہم ہو گیا ہے۔ کامیو کے نزدیک دنیا لغو ہے انسان تنہا نہ ختم ہونے والی اذیتوں کا سامنا کرتا ہے، انسان کے پاس صرف حوصلہ اہمت، یقین اور خود اعتمادی ہوتی ہے جس کے عوض زندگی کی جہد مسلسل میں خود کو ثابت قدم رکھ پاتا ہے۔

سارتر جو عصر حاضر کا نمائندہ فلسفی مانا جاتا ہے، فرد کی بے پناہ اور لامحدود آزادی کا قائل ہے۔ وہ خدا کے وجود کا سرے سے ہی انکار کر دیتا ہے بقول سارتر:

> "God does not exist,man simply is.....ManIs
> nothing else that wich he makes himself"(23)

خدا کے وجود کے انکار کے بعد وہ کہتا ہے کہ اگر خدا موجود نہیں ہے تو بھی ہمیں خود سے خدا کا تصور گھر لینا چاہیے تاکہ نیکی کا وجود دنیا میں قائم رہے گویا دہری وجودیت پسندوں کے نزدیک بھی انسانیت اور نیکی کا معیار خدا کے وجود کے بغیر ناممکن ہے۔ تاہم بیسویں صدی میں ان تمام فلسفیوں نے خدا کے وجود کو ایک فضول اور مہنگا مفروضہ قرار دیا۔ خدا کا وجود انسانی آزادی کی نفی ہے۔ ان کے نزدیک انسان مطلق طور پر آزاد ہے، لہذا وہ جو چاہے کر سکتا ہے ۔ کائنات کی اور کوئی بھی رکاوٹ انسان کے رستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

## ج۔ اردو افسانہ اور وجودیت:

### ا۔ سماجی پس منظر

کسی بھی ملک میں تخلیق ہونے والے ادب کا سماج کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ معاشی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے ساتھ ادب کے موضوعات، مقاصد اور اسالیب بھی بدلتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے مختلف روپ، اس کی داخلی و خارجی کیفیات، سیاسی و سماجی انقلابات اور پھر ان سے متاثر ہونے والی سماجی زندگی ہر عہد میں ادب کا موضوع بنی۔ نثر میں داستان سے افسانہ اور شاعری میں غزل و نظم میں ہر زمانے کے حالات و وقعات کے مطابق انسان اور اس کی داخلی و خارجی کیفیات کو موضوع بنا کر انسانی زندگی کی عکاسی کی گئی۔

اردو کا جدید افسانہ اس وقت پروان چڑھا جب برصغیر پاک وہند غلامی کی زنجیریں کاٹنے میں مصروف تھا۔ اادیب اور شاعر نہ صرف آزادی کی تحریک میں پیش پیش رہے بلکہ ادب میں خصوصا اردو افسانے میں متنوع موضوعات کو متعارف کروانے کا باعث بنے۔ملک کی غلامی،طبقاتی کشمکش،سماجی انتشار،اخلاقی اقدار کا کھوکھلا پن،فرقہ پرستی،رجعت پسندی،مذہب سے دوری،معاشی بدحالی،سیاسی ابتری اور نفسیاتی الجھنوں کو افسانے کا موضوع بنایا۔

موضوع کے مطابق وجودیت کے حوالے سے یہاں اردو افسانے کے سماجی پس منظر کا احاطہ کیا جاناہے،لہذا بیسویں صدی میں پروان چڑھنے والے رجحان (وجودیت) کے مطابق اردو افسانے کا سماجی پس منظر بیان کیا جائے گا۔۱۹۴۷ کی تقسیم برصغیر پاک وہند کی تاریخ کا ایک بڑاالمیہ ہے۔ دوران تقسیم اور تقسیم کے بعد انسانی وقار کی دھجیاں بکھیریں گئی،سماجی اور معاشی زندگی بحرانی کیفیت سے دوچار ہوئی۔دوران ہجرت کئی خاندانوں کی تقسیم ہوئی،باپ بیٹے سے تو بیٹی ماں سے جدا ہو گئ،خون کی ندیاں بہائی گئی،بچ جانے والے ساری زندگی اپنی ذات کے لو تھڑے اکٹھے کرنے میں مصروف رہے،عورتوں اور لڑکیوں کی عصمتیں لوٹی گئیں،ہجرت کر کے آنے والے نہ صرف اپنوں کے بچھڑنے کے غم میں ڈوبے تھے،بلکہ اپنی سرزمیں،معاشرت،اپنی اجداد اور شناخت کے کھو جانے کے قلق میں مبتلا تھے۔

نئے طرز معاشرت کو قبول کرنا، طبقاتی تقسیم،معاشی بحران، طبقاتی تقسیم سماجی برائیاں اور پھر لسانی جھگڑوں نے سماج کو ایک عجب دوراہے پر لا کھڑا کر دیا۔ نتیجا بے بسی،کرب اور اذیت کے سوا کچھ نہ تھا۔ملک کی کمزور معیشت خاندانوں کو پالنے میں ناکام ثابت ہوئی۔ بھوک اور پیٹ پالنے کی خواہش نے فرد کو جرائم کی طرف مائل کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اخلاقی اقدار کو پامال کرنے لگا۔ سارے رشتے ساری قرابت داری ملیامٹ ہو گئیں۔ سماج میں فرد اپنے آپ کو غیر محفوظ اور تنہا سمجھنے لگا۔ ہر طرف بے یقینی اور مایوس کن صورت حال بکھری ہوئی تھی،رہی سہی کسر ملک میں ہونے والے پے در پے مارشل لاءاور پھر سقوط ڈھاکہ نے پوری کر دی۔ملک میں ہونے ولے سیاسی و سماجی انقلابوں کے نعروں کی گونج میں فرد کی آواز دبتی چلی گئی۔ نتیجاً انسان خوف،عدم تحفظ،تنہائی،کرب اور دیگر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتا چلا گیا۔ ایسی گھمبیر صورتحال میں ارود افسانے نے فرد کی داخلی و خارجی کیفیات کو اپنا موضوع بنایا۔اور انسان کو بطور فرد سماج میں متعارف کر دیا۔

اس دور میں بہت سے ایسے افسانہ نگار ابھرے جنھوں اردو افسانے کو نہ صرف فنی اور تکنیکی تجربوں سے ہمکنار کیا، بلکہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور مذہبی جکڑبندیوں میں الجھے انسان کو آزاد کروانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور بکھرے ہوئے انسان کے پارہ پارہ وجود کو سمیٹ کر اعتماد بخشا۔ اور انسان کے باطن میں جھانک کر داخلی کیفیات کو بیان کیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"وجودیت کے خیالات یورپ و امریکہ میں ایک مدت سے عام ہیں لیکن ہندوستان میں ان کا اثر آزادی کے بعد ہی ہونا شروع ہوتا ہے۔ وقت کا یہ فاصلہ خاصہ اہم ہے۔ شاعری کی طرح علامتی اور تجریدی افسانے میں جو ایک طرح کی یاسیت، شکست خوردگی اور مایوسی کی فضا ملتی ہے، اس کا تعلق اتنا وجودیت سے نہیں جتنا کہ ملک کے ان حالات سے ہے جنھوں نے وجودیت کے اثرات کے لئے راہ کھول دی ہے۔ نئی نسل کو آزادی کے فوراً بعد خون کے دریا سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ تہذیبی قدریں جو ہم کو بے حد عزیز ہیں اور جنھوں نے اردو کو ایک عظیم الشان تہذیبی اور لسانی مفاہمت کی شکل میں پیدا کیا تھا۔ ہمارے سامنے پارہ پارہ ہو گئیں۔ اردو زبان کی جائز حقوق آج تک تسلیم نہ کیے گئے۔ آزادی سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں اور جو خواب دیکھے گئے تھے، ان میں سے کتنے شرمندہ تعبیر ہوئے؟ صنعتی طور پر ملک آگے بڑھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ سکے کا پھیلاؤ اور گرانی کس طرف لے جا رہی ہے نیز بے روزگاری، فرقہ ورایت، ذات نسل اور برادری کے تفرقے کس فضا کو قائم رکھے ہوئے ہیں، نوجوان طبقے میں جو اضطراب ہے، توڑ پھوڑ کا رجحان ہے، جو بے چینی ہے وہ بلا وجہ نہیں ہے لاکھوں عوام فاقہ کشی کی زندگی بسر کرتے ہیں، بے ایمانی بدیانتی کا بازار گرم ہے،، منافع خوری اور چور بازاری کے معاملے میں دنیا میں ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ قول و فعل اور کردار و گفتار کا تضاد اپنے فعل کو پہنچ گیا ہے۔ سیاست دیوالی ہو رہی ہے۔، جمہوری قدروں کا زوال عام ہے۔ شکست و ریخت، ریکاری اور مصلحت اندیشی کا دور دورہ ہے اور فرقہ واریت، علاقائیت اور لسانی عصبیت کے عفریت ہر طرف کھڑے ہیں۔ یہ ہیں حوصلے اور ہمت کو پست کر دینے حالات جنھوں نے مایوسی، بے اطمینانی اور بے دلی کی فضا پیدا کر دی ہے اور حساس ادیبوں کا اس سے ذہنی طور پر متاثر ہونا بلکل فطری بات ہے۔ (۲۴)

دیکھا جائے تو جدید اردو افسانے میں غالب رجحان وجودیت کا ہی ہے۔اور وجودیت کے تمام عناصر ہمارے ادب میں منتشر حالت میں موجود ہیں۔

## ۲۔ سیاسی پس منظر

ہر عہد اور زمانے کے اندر تخلیق ہونے والے ادب کے پیچھے سیاسی عوامل اور محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔کوئی بھی ادیب اپنے عہد کے سیاسی پہلوؤں سے ماورا نہیں ہو سکتا۔اور ہر زندہ ادب اپنے عہد کے سیاسی ،سماجی،معاشرتی پہلوؤں کا عکاس ہوتا ہے۔

اردو افسانے کے آغاز وارتقاء کی بات کی جائے تو اس کے پیچھے برصغیر پاک وہند کے وہ المناک حالات و وقعات ہیں جنھوں نے ایک پوری انسانی تاریخ بدل کر رکھ دی۔حکومت برطانیہ کا ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک ایک دردناک المیہ ہے مختلف سیاسی تحریکیں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔اس عہد میں سیاسی تشدد کی تحریکیں زیادہ زور آور ثابت ہوئیں،جلیانوالہ باغ میں ہونے والا قتل عام،عدم تعاون کی تحریک اور دیگر فرقہ ورانہ تحریکیں جنھوں نے انسانی تشخص ذات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی۔

ادیب و شاعر عوام کے اندر سیاسی شعور پیدا کرنے میں پیش پیش تھے،پریم چند کا پہلا سیاسی افسانوی مجموعہ "سوز وطن" جسے حکومت نے ضبط کر لیا بہترین مثال ہے۔انیسویں اور بیسویں صدی میں متعدد ایسے افسانے تخلیق کیے گئے جنھوں نے عوام کے اندر نہ صرف سیاسی شعور اور بیداری کا احساس پیدا کیا بلکہ مظلوم اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے فرد کی آواز بنے۔

ہمارے ہاں اردو افسانے میں وجودی فکر تقسیم ہند کے بعد ہی پروان چڑھتی ہے۔یہ تقسیم بذات خود ایک بہت بڑا سانحہ تھی،مدتوں بعد کی غلامی سے نجات تو ممکن ہوئی مگر یہ نجات اپنے جلو میں خوں خرابہ،ہجرت و فسادات اور انسانیت سوز واقعات بھی لے کر ائی۔ ہجرت و فسادات کی ہنگامہ خیزی میں تمام انسانی رشتے پامال ہوئے،اخلاقی نظام درہم برہم ہو گیا،انسانی عزو وقار خاک میں مل گیا،پورا معاشرہ انتشار کا شکار ہوا ہر طرف موت کی بے حسی اور ویرانی چھا گئی،خوف ودہشت نے مستقل اپنے پنجے گاڑ لیے،انسانی زندگی رائیگاں ہوتی چلی گئی۔

سیاسی بازی گری کے نتیجے میں لوگوں کو مجبورا اپنا وطن ترک کرنا پڑا،اور پاکستان آکر نئے سرے سے کاروبار زندگی کی جہد کرنی پڑی۔۔بے روزگاری اور غربت کے عفریت نے فرد کو مایوسی کے دوراہے پر لا کھڑا کیا۔

رہی سہی کسر ملک میں ہونے والے مارشل لاءاور پھر سقوط ڈھاکہ نے پوری کر دی۔ سقوط ڈھاکہ نے تقسیم ہند کی طرح پاکستان کی تاریخ میں دوررس اثرات مرتب کیے۔ تقسیم کے بعد دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان ہونے وآئے روز ہونے والی باہمی چپقلشوں نے لوگوں کے دلوں میں جنگ کا ایک الگ خوف بٹھادیا۔اس پر مستزداد پاکستان کے حکمرانوں کی من مانیوں اور لاپرواہیوں نے عوام کو ایک الگ دوراہے پر لا کھڑا کر دیا۔ جاگیردرانہ طبقے کی اجارہ داری ااور کمزور طبقے لکااستحصال ایک الگ داستان ہے۔ایسی صورتحال میں جہاں فرد خود اذیتی،اضطراب، کرب،عدم تحفظ اور خوف کا شکار ہوا وہیں وجود کی بقا کا سوال اٹھ کھڑا ہوا۔افسانہ نگاروں نے فرد کے تمام باطنی احساسات کو افسانے کا موضوع بنایابقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"تقسیم کے بعد آزادی کی تگ ودو یک لخت ختم ہو گئی، ہجوم منتشر ہو نظریں انبوہ کے بجائے فرد کو اپنی گرفت میں لینے کی طرف مائل لگیں۔(۲۵)

نئے افسانہ نگاروں کی پود میں انتظار حسین،قرۃالعین حیدر،انور سجاد،خالدہ حسین،انیس ناگی، اعظم فہیمی،منشا یاد ،رشید امجد اور شوکت حیات کا نام سرفہرست ہیں۔ان تمام افسانہ نگاروں نے اس عہد کی سیاسی ،سماجی، معاشی اور معاشرتی صورتحال کو بھانب کر فرد کی تنہائی،اضطراب،اجنبیت، بے گانگی، بے حسی، بے ضمیری، رشتوں کی بے اعتباریت تشویش اور لایعنیت جیسے موضوعات کو موضوع بنایا۔

## ۳۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری

### مختصر سوانحی خاکہ

۷ دسمبر،۱۹۲۳ء کو ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔انتظار حسین کے والد ایک مذہبی آدمی تھے،لہذاان کی دینی تربیت گھر پر ہی ہوئی۔ پرائمری اور مڈل کی تعلیم ہائی سکول ہاپوڑ سے حاصل کی ، گریجویشن اور ایم اے اردو میرٹھ کالج سے کیا۔ ہجرت کے بعد انہوں نے لاہور میں قیام کیا اور یہیں پر صحافت کے شعبے میں ملازمت کی۔ ہفتہ وار اخبار "نظام" پھر "امروز" اور بعد ازاں "آفاق" کے مدیر ہوئے۔انتظار حسین نے کالم نگاری کا آغاز بھی انہیں اخبارات ورسائل میں کیا۔۱۹۴۸ء میں "ادب لطیف" میں ان کا پہلا افسانہ "قیوما کی دکان" شائع ہوا،اور کچھ عرصہ ادب لطیف کی ادارت بھی سنبھالی۔ وقتاً فوقتاً اس زمانے میں نکالنے والے متعدد اخبارات ورسائل کے ساتھ وابستہ

رہے۔کالم اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں بھی اپنا مقام بنایا علاوہ ازیں متعدد مضامین، سفر نامے ااور تراجم انکی تخلیقی کاوشوں کا حصہ ہیں۔

### ۴۔ انتظار حسین بطور افسانہ نگار

انتظار حسین کا شمار عصر حاضر کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اپنے تخلیقی فن اور تجربے کے حوالے سے انتظار حسین کا نام معاصر افسانہ نگاروں کی فہرست میں اول درجے پر ہے۔ اپنے پہلے افسانے" قیوما کی دکان "کے ساتھ ادبی سفر کا آغاز کیا ۱۹۵۳ میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "گلی کوچے" باضابطہ طور پر منظر عام پر آیا۔

انتظار حسین کے افسانے اسلوبیاتی تنوع کے باعث ردو ادب میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔جدید علامتوں،استعاروں، مذہبی روایتوں،اساطیروں اور روایتی قصوں کے ذریعے اردو افسانے کو نت نئی جہتوں سے روشناس کروایا۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول:

> "انتظار حسین اس عہد کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔اپنے پر تاثیر تمثیلی اسلوب کے ذریعے انہوں نے اردو افسانے کو نئے فنی اور معنیاتی اسلوب سے روشناس کروایا اور اردو افسانے کو رشتہ بیک وقت داستان، حکایت، مذہبی روایتوں، قدیم اساطیر اور دیومالا سے ملادیا۔[۲۶]

انتظار حسین کا فن تقسیم کے بعد پروان چڑھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے اس وقت کے ناگفتہ باحالات واقعات کے عکاس ہیں۔ تقسیم اور پھر ہجرت کے حوالے سے یاس انگیزی کی مسلسل کیفیت ان کے افسانوں میں موجود ہے۔ہجرت کا المیہ ان کے افسانوں کا اہم ترین محرک ہے۔ہندوستان کی تقسیم اور پھر ہجرت کرکے پاکستان آنے کا صدمہ مرتے دم تک رہا۔ان کے افسانوں کی فضا میں اپنوں سے بچھڑ جانے کا دکھ،اپنی سرزمیں سے جدا ہونے کا کرب جا بجا بکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس کی بہترین مثال گلی کوچے اور کنکری کے افسانوں میں ملتی ہیں البتہ بعد کے افسانوں میں بھی ہجرت کے واقعات جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔قرآنی ایات،احادیث مبارکہ۔صوفیائے کرام کے ملفوظات،، کتھاؤں وغیرہ پر گہری دسترس تھی،اس کے علاوہ ان کے ذوق مطالعہ میں مغربی مفکروں کی تحریریں بھی شامل تھیں۔

ماضی کی بازیافت ان کے افسانوں کا خاصہ ہے، موجودہ عہد میں سماجی و معاشرتی بکھراؤ، مذہبی و تہذیبی قدروں کی پامالی، اخلاق کی شکست وریخت نے انہیں شدید صدمے سے دوچار کر دیا تھا، وہ موجودہ حالات سے دل برداشتہ ہو کر ماضی کی یادوں اور خوابوں میں کھو جاتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں قارئین کو بار بار ماضی کی ک طرف لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قمطراز ہیں:

"انتظار حسین کے ہاں سفر ایک استعارہ ہے۔ جو انسان کا مقدر ہے اور جو خود اسے بچپن سے انسان کے بچپن تک لے گیا ہے، وہ بار بار ماضی کی طرف پلٹتا ہے، مگر حال کی خاطر، اپنے عہد کے آشوب کو سمجھنے کی خاطر اور اپنے اجتماعی وجود کی کرچیاں چننے کی خاطر۔"(۲۷)

وہ ماضی کی یادوں اور خوابوں کی فضا میں سفر کرتے کرتے ہوئے قاری کو ماضی کے ساتھ جڑے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

قدیم مذہبی قصوں اساطیری روایتوں کا حوالہ دے کر وہ یہ بار آور کرواتے ہیں کہ کس طرح انسان اپنے اصل سے کٹ کر، یا اپنے مقصد سے انحراف کر کے بھٹک جاتا ہے۔ "آخری آدمی" اور "زرد کتا" اسی قبیل کے بہترین افسانے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں خواب اور رات ک کا حوالہ ایک اہم موٹیف ہے۔ وہ ماضی کی ان یادوں اور خوابوں کو واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں جو انسان کی خوشیوں اور مسرت کے ضامن تھے۔ انتظار حسین کے افسانوں کے اکثر کردار کہانی کے آغاز میں ہی خوابوں کے زیر اثر موجودہ صورتحال سے راہ فرار حاصل کرنے کی جہد میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ خود لکھتے ہیں:

"میں نے شہرزاد کے بھید کا پا لیا، کہانی رات کو اس لئے سنائی جاتی ہے وقت کٹے اور رات کٹے۔ میں بھی ایک لمبی کالی رات کے بیچ سانس لے رہا ہوں۔ اس رات کا رشتہ شہرزاد کی راتوں سے ملتا ہے تو گویا اس رات کا بھی یہی توڑ ہے کہ کہانی کہی جائے۔ جب تک رات چلے کہانی چلے اور اسی طور پر جو شہرزاد نے اختیار کیا تھا، یعنی دیکھا کی ارد گرد کی فضا میں تو خون کی بو بسی ہوئی ہے۔ انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ہیں، دہشت اور خوف کا سماں ہے۔ تب اس نے ارد گرد سے ذہنی بے تعلقی کا رویہ اپنایا اور کہانیوں کی ایسی دنیا میں نکل گئی جس کی فضا حاضر و موجود سے یکسر مختلف تھی۔ میں نے سوچا چلو ہم بھی اس راہ پر چلتے ہیں اور اس دنیا میں نکل جاتے ہیں جس میں بس رات تھی اور بس کہانی تھی۔(۲۸)

انتظار حسین کا فن اس عہد میں پروان چڑھا جب اردو کے ادبی افق پر ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی، انتظار حسین نے ترقی پسند تحریک کی لگی بندھی زنجیروں کو توڑ کر اردو ادب میں ایک نئے رجحان "جدیدیت"" کو متعارف کروایا اجتماعیت کے بجائے انفرادیت اور فرد کے داخل کو بنیادی اہمیت دی۔

انتظار حسین اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ موجودہ عہد میں فرد بطور مشین زندگی گزارنے پر مجبور ہے، انسان کے ذاتی احساسات وجذبات کی کوئی قدر باقی نہیں رہی۔ انسان مذہب سے کوسوں دور ہو چکا ہے، سیاسی جبریت نے انسان کی آزادی کو سلب کر لیا ہے، انسان آزاد معاشرے میں سانس لیتے ہوئے بھی غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اسلاف کو بھول کر انسان عہد جدید میں بھٹکتا پھر رہا ہے، اخلاقی اقدار تباہ ہو چکی ہیں۔ انسان اپنی اصل شناخت کھو چکا ہے یہ وہ تمام عوامل ہیں جو انتظار حسین کے ہاں وجودی فکر کا باعث بنے۔ انتظار حسین نے فرد کی خارجی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے داخل کی تمام واردات کو افسانوں کا موضوع بنایا۔

افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو انتظار حسین کے افسانوں میں وجودیت کے تمام عناصر خوف، ڈر تنہائی، وہم، وحشت، شک، دہشت، کرب، بے بسی ,بے اعتمادی، موت، فنا مایوسی، بیگانگی، اذیت لایعنیت اور گمشدگی جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ اسطرح کہ ان کی تفہیم ایک مشکل مرحلہ ہے۔ خوف، ڈر میری ذاتی تحقیق کے مطابق پہلے دور کے مجموعوں میں وجودی عناصر موجود تو ہیں لیکن قدرے بکھری صورتوں میں جبکہ "آخری آدمی" اور اس کے بعد کے تمام مجموعوں میں وجودی عناصر اپنی مکمل صورتوں میں موجود ہیں۔ لیکن تمام افسانوں میں موجود وجودی عناصر کا جائزہ ایک مقالے میں پیش کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ لہذا مقالے کے اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انتظار حسین کے دو مجموعوں آخری آدمی اور شہر افسوس کے افسانوں میں وجودی عناصر کا تحقیقی جائزہ مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔

# حوالہ جات


۱.	علمی اردو لغت (جامع) وارث سرہندی (ایم۔اے)، علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور

۲.	قائد اللغات، مؤلفہ ابو نعیم عبدالحکیم خانشتر جالندھری، حامد اینڈ کمپنی، مدینہ منزل، اردو بازار، لاہور

۳.	حسن عسکری، مجموعہ عسکری سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص۱۲۲۹

۴.	افتخار بیگ، بیسویں صدی کی اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۔اسلام آباد، ۱۹۹۹، ص۱۷

5.	Existentialism A very short introduction by Thomas Flynn, OxfordUniversity Press. p 8

6.	Existentialism and Religious belief by David E. Roberts

۷.	افتخار بیگ، بیسویں صدی کی اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، اسلام آباد، ص۱۵

۸.	سلیم اختر، ڈاکٹر، وجودیت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵، ص۱۱

۹.	خواجہ محمد سعید، ڈاکٹر، وجودیت، تصور موت اور اسلامی تناظر، مشمولہ فکر و نظر، اسلام آباد، جلد۴۷، شمارہ۳، ص۵۳

۱۰.	افتخار بیگ، اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، ص۱۵

۱۱.	قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۔۳۵

۱۲.	علی عباس جلال پوری،، روایات فلسفہ،۔ منظور پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۹۲ء ص۱۷۸۔۱۷۷

۱۳.	ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، مترجم قاضی جاوید، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، ص۱۱

۱۴.	قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاؤس، لاہور ۲۰۱۰ء، ص۵۶

15.	Six existentialism thinker by Harold john Blackham ,p. 5

۱۶.	قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاؤس لاہور۔ ۲۰۱۰ء، ص۹۰

۱۷.	جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۳۲۹

۱۸.	محمد حسن عسکری، مجموعہ عسکری سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص، ۱۲۲۹

۱۹. ایضاً، ص ۱۲۳۰۔۱۲۳۱

۲۰. بختیار حسین صدیقی، پروفیسر، "وجودیت کیا ہے" مشمولہ وجودیت" مرتبہ جاوید اقبال ندیم، وکٹری بک بینک ساہیوال 1989ء، ص ۴۱۴

۲۱. سلیم اختر، ڈاکٹر، تحریری انٹرویو از شاہین مفتی مطبوعہ ادبیات پاکستان جنوری ۱۹۹۵ء،

۲۲. قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳

23. Irrational man by William barret,pg-20

۲۴. گوپی چند نارنگ، پروفیسر، مضمون اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ، مشمولہ اردو افسانہ روایت اور مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۵۱۵

۲۵. وزیر آغا، ڈاکٹر، مضمون اردو افسانے کے تین دور، مشمولہ اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء ص ۱۲

۲۶. گوپی چند نارنگ، مضمون انتظار حسین کا فن، مشمولہ اردو افسانہ روایت اور مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲ء

۲۷. سلیم آغا، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۵۹۶

۲۸. انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۱۸۷

## بابِ دوم:

# انتظار حسین کے افسانوں میں وجودیت کے منفی عناصر

اردو افسانے کا نیا منظر نامہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے سیاسی،، معاشی، معاشرتی اور فلسفیانہ تحریکوں کے زیر اثر رہتے ہوئے پروان چڑھتا نظر آتا ہے، بیسویں صدی میں ابھرنے والی وجودیت کی فلسفیانہ تحریک نے اردو افسانے کو ایک خاص انداز میں متاثر کیا۔ مذکورہ تحریک سے متاثر ہونے والے افسانہ نگاروں نے اپنے فکر و فن کی لازوال قوتوں سے اردو افسانے کو اوج کمال تک پہنچایا۔ انتظار حسین کا نام ان تمام افسانہ نگاروں کی فہرست میں نمایا ں ہے۔ انتظار حسین نے اس عہد کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات ،اخلاقی انحطاط و زوال،اور انسانی جبلتوں کو مذہبی واساطیری پیرائے میں انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں وجودی عناصر کی تشکیل، وجودی کرب،لایعنیت،اجنبیت،عدم تحفظ، نا معلوم کا خوف،مایوسی، الجھن،، بے چارگی اور بے زاری جیسے رویوں سے ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے زیر نظر مقالے میں انتظار حسین کے افسانوں کے حوالے سے وجودیت کے اہم ترین عناصر کرب ،موت ،مایوسی، اکتاہٹ ،لایعنیت، گھن اور کراہت پر مدلل اور تفصیلی بحث کی جائے گی۔

## الف۔ کرب(Anxiety)

کرب وجودیت کا انتہائی اہم ترین عنصر ہے،اس کا تصور ہمیں سب سے پہلے کریگارڈ کے ہاں ''the concept of anxiety '' میں ملتا ہے ملتا ہے۔اس کتاب میں کریگارڈ اولین گناہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے مذہبی واقعے آدم کی اشارہ کرتا ہے۔

> "The anxiety is, by virtue of its innocence or lack of self-consciousness, analogous to that of Adam. Subjective anxiety is also analogous to the anxiety of Adam"(1)

کریگارڈ نے اس مذہبی قصے کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انسان بے شعوری میں گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، تو اسکے اندر رویوں کی ایک نا ختم ہونے والی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ داخلی اضطرب اور کشمکش کی کیفیت انسان کو ایک مسلسل کرب سے دوچار کرتی ہے۔ یہی سے انسان ذات اثبات کے سفر پر چل نکلتا ہے۔ اور اپنے لئے اچھا یا برا فیصلہ کرنے کے اہل ہوتا ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں یہی رویہ ہمیں جا بجا دکھائی دیتا نظر آتا ہے۔ افسانوں کے تمام کردار ایک مسلسل نا ختم ہونے والے کرب کا شکار ہیں۔ اپنی بے شعوری اور جبلتی خصلتوں کے باعث گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں افسانہ "آخری آدمی" کے تمام کردار ایک مسلسل نہ ختم ہونے والے کرب کا شکار ہیں اگر دیکھا جائے تو کہانی کا موضوع قصہ آدم کے بلکل مشابہہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت آدم کو شجر ممنوعہ کا پھل نہ کھانے کی سختی سے تاکید کی گئی، لیکن فطری جبلت سے مجبور ہو کر آدم اور حوا پھل کھانے سے خود کو روک نہ سکے نتیجاً سزا کے مستحق ٹھہرے۔

انتظار حسین نے کا یہ افسانہ اسلامی اساطیر پر مبنی انتہائی اہم افسانہ ہے اس افسانے میں انتظار حسین نے مشہور مذہبی واقعے کا بیان کیا ہے جس میں بستی کے لوگ انسان سے بندر کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں، قرآن حکیم میں بھی اس واقعے کا ذکر موجود ہے۔ انتظار حسین کے اس افسانے میں بستی کے لوگوں کو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا جاتا ہے، لیکن وہ حرص و لالچ میں آ کر خدا کے حکم سے روگردانی کرتے ہیں، اور سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ آخری رہ جانے والا آدمی الیاسف ذہنی و جسمانی تناؤ کا شکار ہے۔۔ یہی عصبی تناؤ اسے کرب میں مبتلا کرتا ہے۔ غم، غصہ، نفرت، تذبذب، شک، خوف، بے چینی، تشکیک اور وہم جیسے رویے اسے وجودی کرب سے دوچار کرتے ہیں۔

> الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا اور وہ بے تحاشی بھاگ چلا جاتا تھا۔ وہ یوں بھاگا جاتا تھا جسے وہ جھیل اسکا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چیٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ پر وہ بھاگتا رہا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ (۲)

افسانے میں خوف دہشت، داخلی کشمکش اور اضطراب ایک مسلسل کرب کی صورتحال کو پیدا کرنے کا موجب ہے۔ افسانے میں اساطیری اور مذہبی عناصر کو تمثیلی پیرائے میں بیان کرکے انتظار حسین نے کہانی کے موضوع کو موجودہ عہد کے ساتھ جوڑ دیا ہے جس میں آج کا انسان اپنا مکمل عکس دیکھ سکتا ہے۔

اسی طرح انتظار حسین کا افسانہ "زرد کتا" معاشرتی تبدیلیوں اور اخلاقی زوال کی کہانی ہے۔ افسانے میں حکایتی، داستانوی اساطیری علامتی اور تقریری انداز اختیار کیا گیا ہے۔ افسانے کے تمام کردار داخلی اور خارجی سطح پر ایک ناقابل برداشت زوال کا شکار ہیں۔ یہاں تک کہ شرف انسانیت سے گر جاتے ہیں۔ لومڑی کا بچہ جو نفس امارہ کی علامت ہے بدی برائی اور شر کی ترغیب دلاتا ہے، آخر میں زرد کتے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ فرد اپنی پوری کوششوں کے باوجود نفس امارہ کی زد میں آجاتا ہے۔

> "ایک چیز لومڑی کا بچہ ایسی اس کے منہ سے نکل پڑی۔ اس نے اسے دیکھا اور پاؤں کے نیچے ڈال کر اسے روندنے لگا، مگر وہ جتنا روندتا تھا وہ بچہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔ (۳)

نفس امارہ سے جنگ اور بدی اور برائی سے بچ نکلنے کی کوشش کرب کا باعث بنتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب انسان بدی اور برائی میں سے انتخاب کے عمل سے گذرتا ہے۔ صحیح اور درست کا انتخاب کرتے وقت اس پر کرب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسا کہ۔

> "میں نے کہا خدا کی قسم میں نے اپنے زرد کتے کو روند ڈالا اور میں چلتا ہی گیا تاآنکہ میرے چھالے پھول کر پھوڑا بن گئے اور میرے پیروں کی انگلیاں پھٹ گئی اور تلوے لہولہان ہو گئے، مگر پھر ایسا ہوا کہ رد کتا، جسے میں روند کر آیا سر منہ نہ ہٹا حتیٰ کہ میں تھک گیا اور میں تھک کر گھٹ گیا اور زرد کتا پھول کر بڑا ہو گیا اور میں نے اسے قدموں سے روند دینا چاہا پر وہ میرے دامن میں لپٹ کر غائب ہو گیا۔ (۴)

انتظار حسین کے افسانوں کے اکثر کردار ماضی کی بھول بھلیوں میں مگن نظر آتے ہیں، ماضی کی تہذیبی روایات اور اپنی تاریخ سے کٹ جانے کا دکھ انتظار حسین کو ہمیشہ سے رہا۔ ان کے نزدیک اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے کٹ جانے کا نتیجہ ہماری شناخت کی گمشدگی ہے پرچھائیں "کا کردار شناخت کے بحران کے کرب سے دوچار ہے وجود کی تلاش اسے ایک مسلسل نہ ختم ہونے والی اذیت اور کرب سے دوچار کرتی ہے:

"تعارف کرواتے ہوئے اس شخص نے جب اپنا نام بتایا تو اس کے کان کھڑے ہوئے یہ تو میرا نام ہے۔اس نے چونک کر اس پر نظر ڈالی۔وہ سکتے میں آگیا اور اس کی پتلیاں پھیلتی چلی گئیں۔اس کی تو شکل وصورت بھی عین مین۔۔۔وہ پھر سر سے پیر تک کانپ گیا اور تیز تیز چلنے لگا، چل کیا رہا تھا بھاگ رہا تھا۔ایک تصور اس کا تعاقب کر رہا تھا۔وہ اس کی زد سے پرے نکل جانا چاہتا تھا۔میں کیوں بھاگ رہا ہوں؟ میں نے قید خانے کی دیوار تو نہیں پھاندی، میں نے کوئی قتل تو نہیں کیا ہے؟(۵)

اسی طرح اسکا سارا دن اپنی ذات کی پرچھائیں تلاش کرنے میں گزر جاتا ہے اور یہی تلاش اسے کرب سے دوچار کرتی ہے۔ "ہڈیوں کا ڈھانچ" ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جو ایک عجیب قسم خوف کے زیر اثر ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ایک عجیب وسوسہ اور وہم اسے کہیں چین نہیں لینے دیتا۔اسے لگتا ہے کہ ایک بھوکا شخص جو مر کر دوبارہ زندہ ہو گیا ہے اس کے تعاقب میں ہے اور اسے تمام لوگوں کے چہرے اس شخص ایک شخص سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ذہنی دباؤ اتنا شدید ہے کہ آخر میں وہ اپنے آپ کو وہی بھوکا شخص سمجھنے لگ جاتا ہے، شروع سے آخر تک کہانی کا کردار اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے جو اس کے لیے گہرے کرب کا باعث بنتی ہے:

"وہ کتا، کتا نہیں تھا یا میں۔۔۔اور وہ شش و پنج میں پڑھ گیا۔میں کون ہوں؟ کیا میں میں ہوں؟ اسے ٹھنڈا پسینہ آنے لگا۔پھر پھر اسے لگا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا ہے۔اور ٹانگیں لمبی لمبی ہو گئی ہیں۔اور اسے بے تحاشا بھوک لگنے لگی۔(۶)

زندگی کی واقعیت اور صورت حال اس کے لئے کرب کی کیفیت پیدا کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی ہی شناخت کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔"کایا کلپ" داخلی اور باطنی کشمکش پر مبنی انتظار حسین کی ایک بہترین علامتی کہانی کہانی ہے۔ کہانی میں دیومالائی اساطیری قصے کو بیان کیا گیا ہے شہزادہ آزاد بخت جو آدمی سے مکھی بن جاتا ہے، اور اس دوران وہ شدید قسم کے ذہنی وجسمانی کرب میں مبتلا رہتا ہے۔ پوری کہانی میں خوف ودہشت کے زیر اثر نفسیاتی الجھنوں اور وجودکی کی بے معنویت کو موضوع بنایا گیا ہے۔شروع سے آخر تک کہانی میں شہزادہ آزاد بخت بیزاریت، خوف، اندیشوں وسوسوں اور شک کے گھیرے میں ہے۔جو اس کے لئے انتہائی اذیت کا باعث ہے۔جیسا کہ:

"شہزادہ آزاد بخت اب شہزادی کی مرضی کے تابع تھا۔اس کی مرضی کے بغیر پتہ نہ توڑتا۔اس کی ایک پھونک سے مکھی بن جاتا اور ایک پھونک سے آدمی کے قالب میں واپس

آجاتا۔ پھر یوں ہوا کہ شہزادی کے پھونک مارنے سے پہلے ہی شہزادہ سمٹنے لگتا اور صبح کو شہزادی کے پھونک مارنے کے بعد دیر تک نڈھال پڑا رہتا، جیسے وہ مکھی کی جون سے نکل آیا ہو، مگر آدمی کی جون میں داخل نہ ہوا ہو۔ درمیانی وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور اس کا ضعف اور اذیت بڑھتی گئی۔۔۔ پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ اذیت کا یہ عمل گزر جانے پر بھی ایک اذیت کی کیفیت کے ساتھ یاد آتا رہتا۔ اور اس نے ایک روز اذیت کے عالم میں یہ سوچا کہ میں آدمی ہوں یا مکھی ہوں۔ (۷)

غرض پوری کہانی میں خوف تحیر، وسوسہ۔ شک، تجسس کے زیر اثر ذہنی وجسمانی کرب کی یہی فضا ملتی ہے۔

اسی طرح اس مجموعے کے دیگر افسانوں ( سوئیاں، شہادت، سوت کے تار ) کے کرادر سیاسی، سماجی، اور معاشرتی سطح پر روحانی واخلاقی انحطاط کا شکار ہیں اور نفسانی خواہشوں کے آگے بے بس ہیں، نفس امارہ کے سامنے یہی بے بسی اور لاچاری انہیں گہرے کرب میں مبتلا کرتی ہے، جس سے چاہ کر بھی چھٹکارہ پانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ "وہ جو کھو گئے" میں ناموں سے محروم چار کردار اپنی ہی ذات کی گمشدگی پر ملال میں مبتلا ہیں، اور ان پر کرب کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہی ذات کے موجود ہونے یا نا ہونے کے حوالے سے گومگو کا شکار ہیں۔

"تب زخمی سر والا تلخ اور افسردہ ہنسی ہنسا: "میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لیئے یہ یاد رکھنے سے کی فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہاں آباد سے نکلا ہوں یا بیت المقدس سے اور یا کشمیر سے۔۔۔" کہتے کہتے وہ رکا۔ زخمی سر والے کی اس بات سے سب عجیب طرح سے متاثر ہوئے کہ چپ سے ہو گئے مگر باریش آدمی آبدیدہ ہوا اور یہ کلام زبان پر لایا کہ "ہم اپنا سب کچھ چھوڑ آئے تھے مگر کیا ہم ہم اپنی یادیں بھی چھوڑ آئے ہیں۔؟ (۸)

آخری جملے میں اپنی سرزمین، اپنا گھر، اپنوں اور یہاں تک کہ اپنی یادوں کو پیچھے چھوڑ دینے کا کرب سمٹ آیا ہے۔ افسانہ سڑھیاں میں خواب اور ماضی کی یادیں کہانی میں ہلکے سے کرب کو جنم دینے کا باعث ہیں۔ اسی طرح افسانہ " مردہ راکھ " میں تحت الشعور میں پڑھی ہوئی ماضی کی یادیں کرداروں کو گہرے وجودیاتی کرب میں مبتلا کرتی ہیں ایسا لگتا ہے کہ اپنے ہی جسم کا کوئی ٹکڑا کٹ کر گم ہو گیا ہو۔

"وہ ان آوازوں میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا، جیسے اس کی ذات انھیں آوازوں اور ان کے ارد گرد بنے ہوئے منظروں اور کیفیتوں کا مجموعہ ہو، جیسے اس کی ذات آگ برساتی دہکتی کربلا ہو اور

اس نے کربلا میں قدم رکھتے ہوئے سوچا کہ سب مجھ پر گزری ہے۔ بازو میرے ہی قلم ہوئے اور زنجیریں بھی مجھے ہی پہنائی گئی ہیں اور کربلا سے دمشق تک پیدل مجھے ہی چلنا ہے ،اور بیچ دشت میں ہی سر بسجود رہا تا آنکہ اس کی ریڑھ کی ہڈی بکھرنے لگی اور آنکھوں کے ڈلے باہر آنے لگے۔ (۹)

افسانہ "شرم الحرم" اور کانا دجال عرب اسرائیل کے پس منظر میں لکھے جانے والا افسانے ہے۔ دونوں افسانوں میں عالم اسلام کے شاندار ماضی کے ذریعے موجودہ عہد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ دجال اور پھر امام مہدی کا ظہور، مسیح کے آنے کی خبر کہانی میں اساطیری فضا کو جنم دینے کا باعث ہے۔ شرم الحرم کا مرکزی کردار اپنے ضمیر کے ساتھ جنگ لڑتا دکھائی دیتا ہے، اور وجودی کرب میں مبتلا ہے، آنکھیں بند کرنے پر اسے لگتا ہے کہ وہ بیت المقدس میں جنگ لڑ رہا ہے، پورے افسانے میں کرب کی فضا ملتی ہے۔

"میں وہاں کہاں تھا؟ کیسے ؟اسے امین کی بات پھر یاد آنے آگئی، جیسے ہلکی سی پھانس چبھی تھی۔ پھر لگا کہ نکل آئی، مگر وہ تو چبھ رہی تھی۔ میں وہاں نہیں تھا۔ (۱۰)

افسانہ "کانا دجال" ۔آ گہی، شرمندگی ، پچھتاوا احساس گناہ اور امت مسلمہ کی بے حسی وجودی کرب کو بیان کرنے کا باعث ہے۔مثال کے طور پر اس جملے میں "جہاں ہمارے حضور بلند ہوئے تھے ،وہاں ہم پست ہو گئے ہیں (۱۱)۔

کراروں کا داخلی کرب سمٹ آیا ہے۔ افسانہ وہ اور میں" میں تشکیک، بے یقینی ،خوف جیسے عناصر مل کر افسانے میں وجودی کرب کو بیان کرتے ہیں۔افسانے کا مرکزی کردار اپنی ہی ذات کے حوالے سے شک اور خوف میں مبتلا ہے۔افسانہ " وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے " میں لا حاصل اور لایعنی مشقت وجودی کرب کی کیفیت پیدا کرتی ہے اس کے ساتھ ہی رات، دیوار سد سکندری اور قوم یاجوج ماجوج کا ذکر کہانی میں اساطیری معنویت بیان کرتا ہے۔ قوم یاجوج ماجوج شب پھر دیوار چاٹتی ہے لیکن صبح ہوتے ہی لمبی آہنی دیوار ان کا منہ تک رہی ہوتی ہے۔ قوم یاجوج ماجوج اس خیال کے ساتھ شدید کرب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ تمام عمر خود کو اس قید سے کبھی نہیں نکا ل سکیں گے۔ "چاٹنا یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے۔ (۱۲)

افسانہ "اندھی گل"، میں دو کردار ماضی کی بھول بھیلوں میں مگن گھوم پھر کر واپس ایک ہی گلی میں آ پہنچتے۔ایک لاحاصل منزل کی جانب سفر کرداروں کو وجودی کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شہر افسوس کی کہانی میں میں بھی تینوں کردار لاحاصل کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں، اپنی ہی سرزمین ادھر ادھر بھٹکتے ہیں ایک کوچے سے دوسرے کوچے کی جانب لیکن باہر نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ شروع سے آخر تک کہانی کے کردار لا متناہی کرب کا شکار نظر آتے ہیں۔

> "جو مر گیا وہ ہے، وہ کیسے بتائے کہ وہ کیوں اور کیسے مرا؟بس میں مر گیا۔" دوسرا آدمی چپ ہو گیا، پھر خود ہی اپنی بے لہجہ آواز میں شروع ہو گیا: اس شہر خرابی میں آخر وہ ساعت آگئی جو سروں پہ منڈلا رہی تھی۔ میں چھپتا پھرتا تھا اور سوچتا تھا کہ اب کیا ہمارے ساتھ وہ کچھ ہو گا، جو ہمارے ہاتھوں ان کے ساتھ ہو چکا ہے۔(۱۳)

دیکھا جائے تو شہر افسوس کے تمام افسانوں میں ہجرت اور اس عہد کے تمام سیاسی، معاشرتی اور معاشی المیوں کا کرب سمٹ آیا ہے۔ ۱۹۶۵ کی جنگ، پے در پے مارشل لاء، اسرائیل عرب جنگ اور پھر مشرقی پاکستان کی علیحدگی یہ وہ تمام عوامل ہیں جنھوں نے بے اطمینانی، بے چینی، بے حسی، خوف اضطراب اور کرب کی فضا کو جنم دیا، شہر افسوس کے تمام افسانے انہیں المیوں سے سروکار ہیں۔

## ب۔ موت

تمام وجودیت پسندوں نے اپنی فلسفیانہ بحث میں موت کے تصور کو مرکزی حیثیت دہ ہے۔" موت" چونکہ ایک اٹل حقیت ہے، اور انسان کے دل و دماغ میں موت کا تصور ازل سے موجود ہے۔" نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے" جاننے کے باوجود انسان موت کے نام سے دور بھاگتا ہے ۔موت کا خوف تمام انسانوں میں یکساں طور پر موجود ہے۔اس کے باوجود انسانی زندگی کی جبریت سے تنگ آکر زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔زندگی کی واقعیت، اخلاقی و سماجی اقدار کا انہدام، ظلم، سیاسی بربریت، خوابوں اور آرزوؤں کی شکستگی اور شناخت کا بحران یہ وہ تمام عوامل ہیں جو فرد کے من میں گہرے وجودی کرب اور اضطراب کو جنم دیتے ہیں۔ایسی صورتحال میں فرد کو اپنا حال و مستقبل گہری تاریکی میں ڈوبا نظر آتا ہے اور وہ زندگی کی تلخیوں اور حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے موت کا خواہش مند ٹھہرتا ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں موت کا تصور ایک الگ طرح سے نظر آتا ہے۔ جیسا کہ انتظار حسین کے افسانوں کے کردار اخلاقی اور روحانی انحطاط کا شکار ہو کر انسانیت کے مقام سے گر جاتے ہیں اور یہی اخلاقی اور روحانی زوال دراصل فرد کی موت موت ہے۔ آخری آدمی، کایا کلپ اور زرد کتا ہڈیوں کا ڈھانچ، ٹانگیں اور شہادت اس قبیل کے بہترین افسانے ہیں۔

"آخری آدمی" میں الیاسف اور بستی کے دیگر افرد الالچ، مکر اور فریب میں آکر اپنی بشریت کھو دیتے ہیں ،آدمی سے بندر کی جون میں آنا اور پھر اخلاقی اور روحانی اقدار کی شکست وریخت افسانے میں موت کے عنصر کو نمایاں کرتی ہے جیسے:

> "اور الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب وہ اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر، افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ لفظ سے محروم ہو گئے۔۔۔اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے کہ آج لفظ مر گیا ہے۔ اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا۔"[۱۴]

یہاں لفظ کی موت دراصل اخلاقی اقدار اور انسانیت کا خاتمہ ہے۔ "زرد کتا" میں خواہشات کے تابع ہو کر روحانی سطح سے نیچے گر جانے والا انسان ہمیشہ نفس کی غلامی کرتا ہے۔ ایسا انسان بظاہر تو ایک جیتا جاگتا انسان دکھائی دیتا ہے، لیکن اپنی ذات کے کھو جانے کا ملال تاعمر رہتا ہے۔ ذات کی گمشدگی فرد کی موت ثابت ہوتی ہے کایا کلپ میں شہزادہ آزاد بخت کا آدمی سے مکھی بن جانا انسانیت کی موت کا نوحہ ہے۔

> "تو پھر یوں ہوا کہ وہ مکھی کی جون میں مگن رہنے لگا، اور مکھی سے آدمی کی جون میں واپس آنا اس کے لئے قیامت بن گیا۔ مکھی کی جون چھوڑتے ہوئے اسے ایسا لگتا جیسے روح قالب کو چھوڑ رہی ہے پھر ایک دن ایسا ہو کہ وہ مکھی کی جون سے بہت کرب و اذیت سے نکلا اور آدمی جون میں دیر تک نہ آیا۔"[۱۵]

تمام وجودیت پسندوں کے نزدیک موت کا مطلب محض فرد کی اس دنیا سے رحلت نہیں بلکہ وجود کی گمشدگی دراصل فرد کی موت ہے۔ وجود کی گمشدگی کا نوحہ ہمیں انتظار حسین کے سبھی افسانوں میں دکھائی دیتا نظر آتا ہے۔ "ہڈیوں کے اڈھانچ" میں موت کی کرخت صورت حال کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کے اندر دو نمایاں عنصر بھو

ک اور خوف نمایاں ہیں۔ معاشی اور معاشرتی حالات انسان کے باطن پر اس قدر اثر انداز ہوتے ہیں کہ وہ ان کے آگے بے بس ہو کر برائی اور گناہ کی جانب راغب ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور یہاں تک کہ حلال اور حرام کی تمیز بھول جاتا ہے۔ اور مردار کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے. یہی وہ عوامل ہیں جو انسانیت کی موت کا باعث بنتے ہیں۔

"ٹانگیں"، شہادت "، سوت کے تار" میں شخصی اخلاقی موت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اپنے نفس اور ضمیر کی پیروی کرنے والے بکری کی ٹانگوں کی مانند نظر آتے ہیں تو کبھی بچھل پائی جیسی مخلوق کے۔ شہادت کا کردار حق کی گواہی دینے سے منکر ہو جاتا ہے، حق کا انکار دراصل اپنے وجود کا انکار ہے۔ "وہ جو کھو گئے" میں ناموں سے محروم چاروں کردار اپنی ذات کے کھو جانے کے ملال میں مبتلا ہیں۔ "موجود ہونا اور نہ ہونا" موت کے احساس کو اجاگر کرتا ہے:

> "یہ کلام سنتے سنتے تھلے والے آدمی نے یاد کیا کہ گنتے ہوئے تو اس نے بھی خود کو نہیں گنا تھا۔ اس نے سوچا کہ کم ہو جانے والا آدمی وہ ہے، بار یش آدمیں دیر تک فکر میں غلطاں رہا، پھر وہ تذبذب کے یہ حرف زباں پر لایا کہ عزیزو! مجھ سے یہ چوک نہیں ہونی چاہیئے تھی مگر مجھ سے بھی ہوئی۔ میں نے گنتے ہوئے سب کو گنا، مگر خود کو فراموش کیا۔ تو جو آدمی کم ہوا ہے، وہ بندہ کمترین ہے۔"(١٦)

افسانہ "کٹا ہوا ڈبا" میں موت کے احساس کو اس طرح سے اجاگر کیا گیا ہے۔

> "مرزا صاحب کچھ اس انداز سے کہ بہت دور نکل گئے تھے اور اب ایک ساتھ واپس آئے ہیں، پھر بولے: سواریاں ختم سفر ختم۔ ریل چل نکلی۔ سفر کو اب طبیعت ہی نہیں لیتی۔ ایک سفر باقی ہے، سو وہ بے سواری کا ہے، وقت آئے گا، چل کھڑے ہوں گے۔۔۔"(١٧)

افسانے میں کرداروں کی نہ صرف زندگی بلکہ زندگی سے وابستہ ہر چیز سے بیزاری اور اکتاہٹ افسانے میں موت کے احساس کو اجاگر کرنے کا باعث ہے "، شرم الحرم، اور "کانا دجال" میں اسرائیل عرب جنگ کے دروان سیاسی جبریت، بربریت اور انسانیت سوز مظالم کی داستان کو پیش کیا گیا ہے، ایک ایسی صورتحال میں جہاں موجودہ عہد کی کربناک صورتحال سے چھٹکارہ پانے کے لئے لوگوں نے موت کو گلے لگانا بہتر سمجھا۔ دونوں افسانوں کی فضا میں موت کا ایک عجب سا خوف رقصاں ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام کی ضمیر فروشی انسانی بے حسی کا نوحہ ہے۔ جو دراصل پوری انسانیت کی موت ہے۔ شرم الحرم میں موت کی کرخت صورتحال کو یوں بیاں کیا گیا ہے۔

"یانباءالعرب! اگر تمہاری گواہی سچی ہے اور اگر میں زندہ ہوں اور اگر تم زندہ ہو تو سنو اور جانو کہ جو مارے گئے، وہ اچھے رہے، بہ نسبت ان کے جو زندہ اور ذلیل ہوئے اور میں جب چلا تھا تو زندہ تھا۔ ہمارے دلوں نے یوں جنبش کھائی جیسے بن کے درخت آندھی سے جنبش کھاتے ہیں اور ہم آدھے یرشلم سے نکلے اور آدھے یروشلم میں جا داخل ہوئے۔۔اس ہنگام میں ایک عدو ٹیلے پر چڑھا اور پکارا کہ اے غافلو! عمان ڈھے گیا ہے۔ میں نے نعرہ مارا کہ میں قائم ہوں، پھر اس نے صدا دی کہ دمشق ڈھے گیا ہے میں للکارا کہ میں قائم ہوں۔ پھر اس نے منادی کی کہ قاہرہ ڈھے گیا۔ میں چلایا کہ میں قائم ہوں، پھر اس نے نعرہ مارا کہ بیت المقدس ڈھے گیا، تب میں نے زاری کی اور کہا کہ میں ڈھے گیا ہوں اور میں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا کہ بیت المقدس ڈھے رہا ہے اور آدمی ایسے بکھر رہے ہیں جیسے تیز جھکڑ میں بھوسا بکھرتا ہے۔"(۱۸)

اسی طرح "شہر افسوس" ہیں تینوں کرداروں کو لگتا ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنے اپنے حصے کی سزا بھگت رہے ہیں اور اس سے سزا سے نجات صرف موت کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ افسانے میں شروع سے آخر تک موت کی کربناک صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔

"تو کیا تو بھی مر چکا ہے؟ تیسرے آدمی نے پوچھا۔

"ہاں!"

"اچھا؟ تیسرے آدمی نے تعجب سے اسے دیکھا: "مگر تو کیسے مرا؟"

"جو مر گیا ہے، وہ کیسے بتائے کہ وہ کیوں، مرا اور کیسے مرا؟ بس مر گیا۔" دوسرا آدمی چپ ہو گیا، اور پھر خود ہی اپنی بے لہجہ آواز میں شروع ہو گیا: اس شہر خرابی میں وہ ساعت آگئی جو سروں پر منڈلا رہی تھی۔ میں چھپتا پھرتا تھا اور سوچتا تھا کہ کیا اب ہمارے ساتھ وہ کچھ ہو گا جو ہمارے ہاتھوں ان کے ساتھ ہو چکا ہے۔"(۱۹)

زندگی کی ناگہانیت اور موت کی اٹل حقیقت کرداروں کو جذباتی سطح پر بے چارگی اور شکستگی سے دوچار کرتی ہے اور یہ انسانی زندگی کا ایک المیہ بھی ہے کہ بے بسی اور بے چارگی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

## ج۔ مایوسی واکتاہٹ

مایوسی وجودیت کا ناگزیر عنصر ہے۔ وجودیت کے تمام عناصر اسی ایک وجودی رویے کے زیر اثر پروان چڑھتے دکھائی دیتے ہیں یہ ایک ایسی صورتحال ہے جس میں فرد خود کو ہر لمحے گھرا ہوا پاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کا اختیار کسی شے پر نہیں۔ وقت اور حالات کا جبر، مستقبل کے خوف و خدشات انسان کو ایک ایسے موڑ پر لا چھوڑتے ہیں جہاں انسان زندگی کے حوالے سے مایوس ہو جاتا ہونے کے ساتھ ساتھ اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جس کیفیت میں وہ مبتلا ہے اس سے بچ نکلنے کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔ مایوسی اور ناامیدی کا غلبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ فرد خود کشی جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کرنے پر مجبور ہو جاہے۔ انسان جو زندگی میں موت کے خوف سے ہر لمحہ بھاگتا رہتا ہے شدید داخلی ہیجان میں موت کو گلے لگانے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ وجودی مایوسی کے پیچھے دو طرح کے عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں، فرد جس عہد میں سانس لے رہا ہے اس عہد کے ریاستی، سماجی، معاشرتی، معاشی مسائل جن کے آگے فرد بے بس ولاچار ہے دوسرا یہ کہ فرد کی عجلت پسندی اور انانی تکبر جس کے تحت وہ اخلاقی پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہاں انسان یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ وہ کائنات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا اختیار رکھتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ کائنات کا نظام صرف ایک ہستی "خدا کے ہاتھ میں ہے۔ سب کچھ اپنی مرضی کے مطابق نہ ہوتا دیکھ کر مایوسی کا شکار یا جاتا ہے اور اپنی ذات کے انکار کے ساتھ ساتھ خدا کے وجود اور اس کے حکم سے بھی انکاری ہو جاتا ہے۔ انسان مایوسی اور اکتاہٹ کا شکار ہو کر خود کشی یا کسی اور گناہ کی جانب مائل بہ قدم ہوتا ہے تو یہ انسان کا اپنا خود مختارانہ فیصلہ ہوتا ہے یہاں وہ بے بس نہیں بلکہ موجودہ صورتحال کو برداشت کرنے کے لئے خود کو تیار نہیں کر پارہا اور نتیجاً خود کو اخلاقی پستی میں گرادینے کا باعث بنتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں کے کرداروں مایوسی کی کیفیت مختلف سطحوں پر دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے مایوسی کی مختلف صورتوں اور جہتوں کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے، کرداروں میں تنوع ہے۔ کچھ وقت اور حالات کے ساتھ لڑ کر اپنے آپ کو موجودہ صورتحال سے نکالنے کی جہد میں مگن ہیں لیکن ان میں سے اکثر مایوسی کی حالت میں حق سے گریزاں اور فطرت کے خلاف جا کر روحانی و اخلاقی انحطاط کا شکار ہیں۔

افسانہ "آخری آدمی" "زرد کتا"۔ کایا کلپ، شہادت، ٹانگیں، ہڈیوں کا ڈھانچ اس قماش کے بہترین افسانے ہیں، آخری آدمی میں الیاسف وقت اور حالات کو اپنے بس میں کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے:

"الیاسف اپنے حال پر رو دیا اور بندروں سے بھری بستی سے منہ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اب اس کے لئے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درختوں کی ٹہنیوں میں چھپ کر بسر کی۔(۲۰)

اسی طرح زرد کتا میں جبلتی اور فطری خواہشات کے سبب انسان کے باطن میں ہونے والی تبدیلیوں کو اس کے ظاہر میں ہوتا ہوا دکھایا ہے۔ کہ جب انسان اپنی خواہشات کے تابع ہو کر فطرت کے خلاف جانے کی کوشش کرتا ہے تو سوائے ناکامی اور مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کائنات کے نظام کو اپنی خواہشات کے مطابق نہ ہوتا ہوا دیکھ کر خدا کی ذات سے بھی منکر ہوتا چلا جاتا ہے اور خدا سے دوری اپنے موضوعیت سے دوری ہے اور جب انسان اپنے موضوع سے کٹ جاتا ہے تو مایوسی اسکا مقدر ٹھہرتی ہے۔

اپنے تشخص کو برقرار رکھنے اور وجود کے اثبات کی کوشش فرد کے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ خدا کی ذات سے دور ہے اور کل کائنات میں اکیلا اور تنہا ہے۔ اکیلے پن اور تنہائی کا احساس فرد کو ہمیشہ مایوسی میں گھیرے رکھتا ہے۔ اب یہی وہ مقام ہوتا ہے جب فرد کے اندر دو قسم کی رویے جنم لیتے ہیں یا تو وہ اپنی ذات کا اثبات چاہتے ہوئے خدا کی ذات کے ساتھ کامل جڑے رہتا ہے۔ مایوسی کے دائرے کو توڑتا ہوا اپنے لئے روشن اور صحیح راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ اور دوسرا منفی رویہ جس میں فرد انسانی سطح سے ہی خود کو گرا لیتا ہے اور مایوسی کے چنگل سے کبھی نکل نہیں پاتا۔ زرد کتا کا آخری کردار آخر وقت تک اپنی ذات کے اثبات کے لیے لڑتا ہو نظر آتا ہے اور موجودہ صورتحال سے بچ نکلنے کے لیے وہ ایک غیبی مدد کا سہارا لیتا ہے:

"میرا دل اندوہ سے بھرا ہوا تھا اور میں نے دعا کی کہ بار الٰہا آرام دے، آرام دے، آرام دے۔ اور میں نے رات بھر دعا کی اور دریا کی طرف دیکھا اور رات بھر غبار آلود تیز ہوا زرد رو پیڑوں کے درمیان چلا کی اور رات بھر درختوں سے پتے گرا کی۔ میں نے دریا سے نظر ہٹا

کر اپنے ارد گرد اٹے جسم کو دیکھا، اپنے ارد گرد زرد پتوں کی ڈھیریاں دیکھی اور میں نے سوچا
کہ یہ میری خواہشیں اور ارمان ہیں۔ خدا کی قسم میں آلائشوں سے پاک ہوا اور پت جھڑ کا
برہنہ درخت بن گیا۔ (۲۱)

اسی طرح افسانہ پرچھائیں میں شروع سے آخر تک شناخت کا بحران ایک مسلسل مایوسی کی کیفیت پیدا کر رہا ہے، مسلسل مایوسی کی کیفیت وجودی کرب کو جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔ مجموعہ آخری آدمی کے تقریباً سبھی افسانوں کے کردار مایوسی کی زد میں مختلف سطحوں پر نظر آتے ہیں۔اس کیفیت کے پیچھے اس عہد کے تمام بیرونی و خارجی عوامل کارفرما ہیں۔اسی طرح شہر افسوس کی پہلی کہانی "وہ جو کھو گئے" میں اپنے ماضی سے الگ ہو جانے کا دکھ، شخصی انا کے کھو جانے کا احساس چاروں کرداروں کو مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔مایوسی کی کیفیت میں وہ بار بار اپنے آپ کی ہی تلاش میں ایک انجانی آواز کے تعاقب میں چل کھڑے ہوتے ہیں۔

"کیا صورتیں تھیں کہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔نوجوان افسردہ ہو کر بولا۔
وہ یادوں ہی یادوں میں دور تک گیا،اس ساعت تک جس ساعت اس نے اپنی زندگی کا پہلا
بوسہ کسی لب پر ثبت کیا تھا اور اس نے وہ اعلانات کیے جو ایسی ساعت میں کیے جاتے ہیں کہ
اس ساعت میں وقت اور معاشرہ: دونوں ہیچ دکھائی دیتے ہیں اور محبت کا راستہ جاوداں نظر آتا
ہے۔اس ساعت کو اس نے ایک اداسی کے ساتھ یاد کیا، پھر بڑبڑایا:
اگر وہ اس وقت یہاں ہوتی تو ہم پورے ہوتے۔"(۲۲)

افسانہ "کٹا ہوڈبا" جس میں رات، ریل، پٹڑی، جنگل ج اندھیرا جیسی علامتیں افسانے میں مایوسی اور افسردگی کی فضا کو جنم دیتی ہیں۔

ساری کہانی ماضی کی یادوں کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔افسانہ "ہ دہلیز" میں صفیہ ماضی کی جادوئی محبت میں گرفتار ہے۔اپنی زمین سے محبت اور اس سے جڑے رہنے کی خواہش حال میں رہتے ہوئے بار بار ماضی کی یادوں میں کھو جانا اور پھر مستقبل کے حوالے سے خوف و خدشات افسردگی کی فضا کو جنم دیتے ہیں۔

افسانہ سڑھییاں اور مردہ راکھ ایک ہی تسلسل میں لکھی گی کہانیاں ہیں جن میں انتظار حسین نے اساطیری اور مذہبی علامتوں کا استعمال کر کے ماضی کو حال کے ساتھ جوڑا ہے۔خواب علم، کنواں، بندر، پتنگ جیسی علامتیں اور مردہ راکھ میں ذالجناح،، کربلا، دلدل، تلواریں، زنجیریں جیسی علامتوں کا ستعمال کر کے مسلمانوں کے عروج و

زوال اور ذلت و پستی کی داستان سنائی ہے۔اپنی زمیں اپنی جڑوں اور روایتوں کے ساتھ کٹ کر آج کا انسان اپنی شناخت کھو کر افسردہ اور غمگیں ہے۔

"شرم الحرم اور کانا دجال میں عالم اسلام کی بے حسی کا نوحہ دکھ اور مایوسی کی فضا کو جنم دیتا ہے۔دونوں افسانوں کے کردار انسانیت سوز مظالم پر گہرے گم اور تشویش کا اظہار کرتے ہیں ،۔ غرض دونوں افسانوں میں بیچارگی، تنہائی، بے بسی کی فضا مایوس کن صورتحال کا باعث ہے۔شرم الحرم کا کردار جس کی نیند آڑ جاتی ہے اور آنکھیں بند کرنے پر اسے لگتا ہے کہ وہ بیت المقدس میں جنگ لڑ رہا ہے اس کے منہ سے ادا ہونے والے دکھ اور افسوس بھرے جملے پورے قاری لکو بھی ایک گہرے کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں کہانی کا اختتام بھی ایک مایوسی سے لبریز جملے میں ہوتا ہے:

"میں نے زاری کی اور کہا کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ بیت المقدس
کی بیٹی بے حرمت ہو گئ، شرم العرب۔شرم العجم۔شرم الحرم۔ [۲۳]

کانا دجال کے تینوں کرداروں کی گفتگو اور افسانے کا ہر پیرا گراف قاری کو بھی گہرے دکھ میں مبتلا کر دیتا ہے افسانے کا یہ پیرا گراف:

"پلنگ پر بیٹھی ہوئی اماں جی چھالیاں کاٹتے ہوئے رونے لگیں انہوں نے سروتا تھالی میں رکھا اور آنچل سے آنسو صاف کرنے لگیں۔ابا جان کی آنکھ بھر آئی مگر ضبط کر گئے اپنے پروقار لہجے میں شروع ہوگئے۔آنحضورؐ دریاؤں ،پہاڑوں صحراؤں سے گزرتے چلے گئے۔مسجد اقصی میں جا کر قیام کیا۔حضرت جبرائیل نے عرض کیا کہ یا حضرت! تشریف لے چلیے! آپؐ نے پوچھا کہاں؟ بولے کہ یا حضرتؐ! زمین کا سفر تمام ہوا۔یہ منزل آخری تھی۔اب عالم بالا کا سفر در پیش ہے۔تب حضور بلند ہوئے اور بلند ہوتے چلے گئے۔۔۔پھر انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا'بولے:"جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے وہاں ہم پست ہو گئے۔ [۲۴]

"بگڑی گھڑی" کے تمام کردار وقت اور حالات کو اپنے بس میں نہ ہوتا دیکھ کر مایوسی اور افسردگی کا شکار نظر آتے ہیں۔پورے افسانے میں ایک دھیمی افسردگی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔

"وہ ودیوار کو نہ چاٹ سکے" میں بوڑھا دانشمند یاجوج ماجوج کی بے رہ روی اور ان کے غیظ و غضب کو دیکھ کر مایوس ہو جا ہے۔ یہاں پر بوڑھے دانش مند کا کردار بطور ایک لیڈر کے سامنے آتا ہے جو اپنی قوم کو لالچ مکر اور فریب سے دور رہنے کی نصیحت کرتا ہے لیکن قوم یاجوج ماجوج پر رتی بھر اثر نہیں ہوتا:

> "بوڑھے نے افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ "چاٹنا یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے وہ سد سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے۔ اور یاجوج ماجوج اپنی لال زبانوں کے ساتھ آپس میں گھتم گھتا ہو گئے۔ بوڑھے دانشمند نے انہیں گھتم گھتا دیکھ کر بصد افسوس کہا کہ "یافث کی اولاد دو مونہا سانپ بن گئی کہ خود کا ہی ڈس رہی ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ واپس اپنی کھوہ میں چلا گیا۔ (۲۵)

قوم یاجوج ماجوج ایک لاحاصل اور لامتناہی جدوجہد کے بعد اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ پیدا ہی اس لیئے ہوئے ہیں کہ تمام عمر وہ دیوارا کو چاٹتے رہیں۔ اندھی گلی میں اپنے آبائی گھر کی تلاش اور اپنے پیاروں کی یادیں ایک مایوس کن صورتحال پیدا کرتی ہیں:

> "یار پنا تو کوئی رہا نہیں جسے میں یاد کر۔" وہ پھر املی کی اونچی شاخوں کو تکنے لگا۔ حافظے نے آہستہ آہستہ کروٹ لی اور اسے ایک ایک کر کے سب یاد آئے۔ وہ بھی جو مارے گئے اور بھی جو لاپتہ ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ کتنی طویل بے حسی کے بعد ان دونوں کے دل حرارت سے اور آنکھیں نمی سے آشنا ہوئی تھیں۔ (۲۶)

اسی طرح شہر افسوس کا ایک ایک جملہ خوف، دہشت، درد اور مایوسی سے لبریز ہے۔ پورے افسانے میں بے یقینی اور افسوس کی فضا پھیلی نظر آتی ہے۔

## د۔ لایعنیت

لایعنیت وجودیت کا غالب ترین عنصر ہے جبر و استبداد غلامی، سیاسی اتار چڑھاؤ اور خون خرابہ اور انسانیت سوز مظالم نے زندگی کے سارے رنگ گم کر دیئے۔ سارے منظر پھیکے اور ہر کیفیت بے سرور ہو گئی۔ ساری انسانیت نے بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اور انسان اپنی ہی ذات کے حوالے سے ایک عجیب قسم کے مخمصے میں گھر کر خود

کو ہی شک کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا ۔اس ساری صورتحال کو جودی فلسفیوں نے وجودی بحران اور وجودی لایعنیت سے موسوم کیا ہے، زندگی کی لغویت اور اس کے ہیچ ہونے کا تصور وجودی فلسفے کا بنیادی نقطہ ہے۔

زندگی کی پژمردگی اور جبریت فرد کو ایک وجودی خلا میں دھکیل دینے کا باعث ہے اور یہی وجودی خلا فرد کو آہستہ آہستہ ایک مہیب لایعنیت کے احساس میں جکڑ دیتا ہے۔انسان اس کیفیت سے خود کو نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے ۔اور بعض اوقات انسان شدید ہیجان کی کیفیت میں خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور دیگر صورتوں میں وہ زندگی کے حوالے سے بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اگر دیکھا جائے تو تمام وجودی فلسفیوں کے ہاں زندگی کی اس لایعنی صورتحال کا احساس غالب ہے۔البرٹ کامیو کے مشہور شہرہ آفاق ناول "the stranger" میں "مرسو" کا کردار اپنی ماں کے مرنے پر بھی کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کرتا اور اس شام میں وہ خوب عیاشی کرتا ہے اور کسی کا قتل کر کے جیل چلا جاتا ہے ۔جہاں تک کہ وہ خود کو دی جانے والی سزا کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

بیسویں صدی میں برصغیر پاکوہند کی دھرتی پر ہونے والے موت کے رقص نے فرد کو زندگی کی لغویت کا احساس دلایا نتیجا فرد زندگی سے کٹتا چلا گیا۔ زندگی کے حوالے سے اسکا رویہ بیزاریت آمیز ہتا چلا گیا۔اور یہی بیزاریت اسے احساس دلاتی ہے کہ زندگی کے حوالے سے اسکی تمام کوششیں مہمل اور لایعنی ہیں یہاں تک کہ خود اسکا اپنا وجود بھی۔ زندگی کا انتشار ۔معاشرتی و سماجی رویے ،جبریت و غلامی فرد کے لیئے منفیت کے لئے منفیت کا پیغام بن جاتی ہے۔اور وہ طے شدہ روایات اخلاقیات اور اقدار کو قبول کرنے سے انکاری ہو جاتا ہے۔اپنی اسی منفیت کے باعث وہ انسانی درجے سے حیوانی درجے پر آجاتا ہے۔

افسانہ "آخری آدمی" زرد کتا اور کایا کلپ میں لایعنیت کی گھمبیر صورتحال ملتی ہے۔ نفس امارہ سے جیت جانے کی جنگ اور پھر اسکا نفس پر حاوی ہونا آدمی سے بندر اور مکھی کی جون میں آنا ایک مسلسل لایعنی کیفیت ہے۔تینوں افسانوں کے کردار ایک گہرے وجودیاتی کرب کی گرفت میں ہیں۔الیاسف جو بندروں سے بھری بستی میں خود کو اکیلا اور تنہا پاتا ہے، شہزادہ آزاد بخت مکھی کی جون میں آزادی کا خواہش مند ہے اور موجودی صورت حال میں خود کو بے بس و مجبور پا کر تنہائی کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے اور موجودہ صورتحال کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا رستہ نظر نہیں آتا،ابوالقاسم کے الفاظ "جہاں سب زرد کتے بن جائیں وہاں آدمی بنے رہنا کتے سے بھی بدتر ہوتا ہے۔"

تینوں کردار اپنے اپنے طور زندگی کے معمولات مہمل کے ساتھ جنگ لڑنے میں مصروف ہیں، لیکن حالات نارمل ہونے کے بجائے مزید الجھتے چلے جاتے ہیں۔ حالات کا یہی الجھاؤ لایعنیت کا احساس پیدا کرتا ہے جو تنہائی اور بے بسی کا نتیجہ ہے۔:

"اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر غور کیا اور ابن زبلون اور الیاب کو یاد کیا کہ کیونکر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی تھیں۔ الاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور اس نے سوچا اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں۔ اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا مگر یہ خیال اسے انہونا نظر آیا اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں بدلا نہیں ہوں۔(۲۷)

ذات کی یہی فناپذیری افسانے میں لایعنیت کا احساس پیدا کرنے کا باعث ہے۔

زرد کتا میں مختلف اساطیری و مذہبی حکایتوں کے ذریعے دنیا کی اصل حقیقت اور بے ثباتی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ انسان دنیاوی لالچ اور طمع میں آ کر اخلاقی و رحانی زوال کا شکار ہو جاتے ہیں ااور اخلاقی زوال دراصل انسانیت کا قلع قمع ہے۔ بقول ڈاکٹر سجاد باقر رضوی:

"روحانی طور پر انحاط پزیر معاشرے میں صاحب کلام منہ پر تالا ڈال لیتے ہیں اور زندہ انسان سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں اور یوں لفظ مر جاتے ہیں اور لفظوں کی موت سے زندگی کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔(۲۸)

زرد کتا میں لغویت کا احساس کچھ اس طرح سے ملتا ہے:

"سید علی الجزائری اپنے زمانہ کے نامی گرامی شعلہ نفس خطیب تھے پر ایک زمانہ آیا کہ انہوں نے خطاب کرنا یکسر ترک کر دیا اور زبان کو تالا دے دیا۔ تب لوگوں میں بے چینی ہوئی۔ بے چینی بڑھی تو لوگ ان کی خدمت میں عرض پرواز ہوئے کہ خدارا خطاب فرمایئے انہوں نے فرمایا اچھا ہمارا منبر قبرستان میں رکھا جائے، اس نرالی ہدایت پر لوگ متعجب ہوئے۔ خیر منبر قبرستان میں رکھ دیا گیا۔ وہ قبرستان میں گئے اور منبر پر چڑھ کر ایک بلیغ خطبہ دیا اس کا عجب اثر ہوا کہ قبروں سے درود کی صدا بلند ہوئی۔ تب سید ابوالجزائری نے آبادی کی طرف رخ کر کے گلوگیر آواز میں کہا: اے شہر تجھ پر خدا کی رحمت ہو، تیرے جیتے لوگ

بہرے ہوگئے ہیں اور تیرے مردوں کو سماعت مل گئی۔ یہ کہہ کر وہ اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گی ٗاور اس کے بعد انہوں نے بستی سے کنارہ کیااور قبرستان میں رہنے لگے جہاں وہ مردوں کو خطبہ دیا کرتے تھے۔ (۲۹)

درج بالا اقتباس میں شیخ الجزائیر دنیا کے بے حس رویوں سے اکتا کر اور دنیا کی زندگی میں جائے پناہ تلاش کرنے کے بجائے قبرستان میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پرچھائیں میں وجود کی تلاش میں سر گرداں بے نام راہوں پر بھٹکتا پھر رہا ہے۔اس ساری کوشش میں اسے اپنا آپ بھی مہمل محسوس ہوتا ہے:

"وہ جسم جو پرچھائیں سے ماورا تھااور اپنا بدن جو محض پرچھائیں ہے اور جس پر مکھیوں کا بسیرا ہے اور جس پر کوئی بادل سایہ نہیں کرتا۔"(۳۰)

افسانہ ہڈیوں کا ڈھانچ میں بھوک، سانپ، کچھوے مر کر زندہ ہو جانے وال شخص لایعنی احساس پیدا کرتے ہیں کہ کس طرح انسان سماجی اور معاشرتی بے حسی کے باعث حلال ح اخلاقی زوال کا شکار ہو کر حرام کی تمیز بھول جاتا ہے۔ااور کبھی ہڈیوں کا ڈھانچ اور کبھی بکری کی ٹانگوں والے انسان کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

"ہمسفر" میں بے نام منزل کی جانب سفر زندگی کی مہملیت کے حوالے سے علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے بے نام منزل کی جانب سفر نہ سرف مہمل ہے بلکہ فرد لے لئے ایک گہرے وجودیاتی کرب کا باعث ہے ہے۔افسانے میں تنہائی اور بے زاری لایعنیت کے احساس کو اجاگر کرنے کا باعث بن رہی ہے۔

معاشرتی سطح پر جذباتی پراگندگی اور ذہنی انتشار فرد کو اسکے وجود سے عاری کر دیتی ہے۔اور یہاں پر فرد ے اندر لاحاصلی اور لایعنیت کا احساس حاوی ہونے لگتا ہے:

"میں کون ہوں ؟اس سوال نے اسے بہت گڑ بڑایا۔اس نے یہ طے کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ کون ہے !لیکن وہ یہ طے نہ کر سکا کہ وہ کون ہے اور اسے شک ہوا کہ اسے اپنے بارے میں کچھ اسی قسم کا شک ہو چلا تھا جو اسے یاسین کے بارے میں اور یاسین کو دوسروں کے بارے میں چل آتا تھا اس شک کے جھمیلے کو اس نے ایک ہی وار میں توڑ ڈالا اس نے ایک لمبی سی جماہی لی اور دل میں کہا کہ میں جو کوئی بھی ہوں !بحر حال میں ہوں،اسے دفعتاً احساس ہو

> کہ اسنے کوئی بہت بڑا دعوا کر ڈالا ہے اور یہ احساس ہوتے ہی اس کا دعویٰ ایک شک بھرے سوال میں بدل گیا"۔ (۳۱)

اپنے ہونے نہ ہونے کا یہی شک فرد کو زندگی کی لایعنیت کا احساس دلاتا ہے اور پوری زندگی فرد کے لئے ایک وہم بن کر رہ جاتی ہے۔

افسانہ "سوئیاں" میں شروع سے آخر تک زندگی کے لایعنی ہونے کا احساس حاوی رہتا ہے۔ خوابوں اور خواہشات کے پیچھے بھاگنا اور کچھ حاصل نہ ہونا، ظالم قوتوں اور حالات کے جبر کے آگے فرد کی بسی اور لاچاری لایعنیت کا سبب ہے:

> "شہزادی نے ایک تاسف کے ساتھ اجنبی کے ساکت جسم کو دیکھا، پھر اپنی لہولہان پوروں پر نظر کی۔ عین اس گھڑی قلعہ کے در و دیوار کانپے اور دیو گرجتا دہاڑتا قلعے میں داخل ہوا۔ اس نے شہزادی کو ساتویں کوٹھڑی کھولنے کی سزا یہ دی کہ اس پہ نوکوڑی برسائے۔ چابیوں کا گچھا اس سے چھینا اور ساتوں کوٹھریاں بند کر گرجتا برستا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ (۳۲)

افسانے میں شہزادے کے جسم سے سوئیاں نکالنے کا عمل لایعنی اور لاحاصل مشقت ہے۔ افسانہ سوت کے تار میں انتظار حسین نے قرآن کی آیت کا حوالہ دیا ہے کہا ایک عورت محنت اور مشقت کے ساتھ سوت کاتتی ہے اور پھر اسے خود ہی ادھیڑ دیتی ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے بطور تمثیل بیان کی گئی جو زندگی میں حاصل ولاحاصل کی تگ و دو میں اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ ایسا نقصان جس کا مداوا ناممکن ہو جاتا ہے اور بلآخر موت انہیں گلے لگا لیتی ہے:

> "وہ کھونٹ کھونٹ ہوتا واپس ہوا۔ اور وہ حیران ہوا یہاں جو مکان تھے وہ کہاں گئے۔ ٹخنوں ٹخنوں مٹی میں چلتا تباہ و برباد عمارتوں کے درمیان سے گزرتا وہ اندھیرے میں واپس پہنچا۔ رات کا ڈیرا تھا اور قلعہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا کہ میں نہیں نکلا تھا، پھر وہ دراز ہوا۔ اور اپنی جلتی آنکھوں اور دکھتے جسم سکے ساتھ سوچا اور کہا سب سوئیاں میرے اندر رہیں، میں زندہ نہیں ہوں میں نے اقرار کیا اور میں نے گواہی دی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لی اور وہ مر گیا۔ (۳۳)

"وہ جو کھو گئے" میں ذات کے کھو جانے کا کرب، خوف، ڈر، وسوسے یہ تمام کیفیات زندگی کی مہملیت کو سامنے لاتی ہیں۔

"کٹا ہوا ڈبا" تنہائی کی علامت ہے۔ اپنے اجتماع سے کٹ کر اکیلا رہ جانے والا ڈبا (فرد) زندگی کی بھاگ دوڑ میں خود کو اکیلا اور تنہا کھڑا پاتا ہے۔ زندگی کی الجھنیں سلجھاتے سلجھاتے لایعنی احساس میں گھر جاتا ہے۔ افسانہ "سڑھیاں" اور "مردہ راکھ" میں ماضی کی یادیں، اپنی زمین اپنی تہذیب اور ثقافت سے کٹ جانے کا احساس زندگی کو بے معنی بنا دیتا ہے۔

"کاناد جال" اور شرم الحرم میں عرب اسرائیل جنگ کے اثرات اور پیش آنے والے حالات واقعات کے ذریعے زندگی کی لغویت کا بیان ملتا ہے۔ جب انسانی عظمت اور روایتی اقدار ملیامٹ ہو کر رہ گئے، عالم اسلام کی بے حسی اور ضمیر فروشی نے زندگی کو ایک لاحاصل اور لغو عمل بنا دیا۔

افسانہ وہ جو دیورا کو نہ چاٹ سکے زندگی کی لغویت کے حوالے سے ایک بہترین مثال ہین قوم یاج ماجوج دیوار چاٹنا جن کا مقدر لکھ دیا گیا ہے سسی فس کے ہیرو کی مانند بے مقصد اور بے سود تگ ودو کا المیہ قبول کر لیتی ہے۔

افسانہ "اندھی گلی" میں دو کردار اپنے ہی وطن کی گلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں جاتے، لیکن ہر گلی انہیں بند ملتی ہے۔ ان کا گلیوں میں بھٹکنا، خوف، سرپٹ بھاگنا، ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھنا اور ایسے ہی امور کہانی میں لایعنیت کے احساس کو اجاگر کرتے ہیں۔

شہر افسوس کی کہانی میں میں بھی تینوں کردار لاحاصل کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں، اپنی ہی سرزمین ادھر ادھر بھٹکتے ہیں ایک کوچے سے دوسرے کوچے کی جانب لیکن باہر نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ نہ ہی کوئی زمین انہیں قبول کرنے کو تیار ہوتی ہے دربدر بھٹکنا زندگی کی بے معنویت اور بے سمتی کی طرف اشارہ ہے۔ تینوں بلاآخر ایک ایسی سرزمیں پر آجاتے ہیں اور معلوم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ شہر افسوس ہے جہاں سب انسان موت کا انتظار کر رہے ہیں اور یہاں سے انسان صرف موت کے ذریعے ہی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ مکالمہ ملاحظہ ہو:

> "اے بزرگ! کیا تو نے دیکھا کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں، پھر کوئی زمین انہیں قبول نہیں کرتی! میں نے دیکھا اور یہ جانا کہ ہر زمین ظالم ہے۔۔۔ جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی؟ ہاں! جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی اور جو زمین دارالامان بنتی ہے، وہ بھی۔ میں نے گیا نام کے نگر میں جنم اور گیا کے اس بھکشو نے یہ جانا کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے اور نروان کسی صورت نہیں اور ہر زمین ظالم ہے۔ [۳۴]

زمین، انسانیت، اعتماد اور حق کے باطل ہو جانے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ایسے لوگوں کے لئے دنیا ایک شہر افسوس بن جاتی ہے اور پھر وہ مہاتمابدھ کی طرح ویرانوں اور جنگلوں کی طرف نکل جاتا ہے اور زندگی کے اس کھوکھلے پن کا مذاق اڑاتا ہے لیکن زندگی کے دکھ اور تکالیف مسلسل اس کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ اور فرد کی زندگی لایعنی اور مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو "وہ جو کھو گئے" شہر افسوس اور اندھی گلی کی مجموعی فضا تقریباً یکساں ہے۔ بھٹکنا اور درماندگی تینوں کہانیوں کے کرداروں کا مقدر ہے۔ بے سمتیت، بے مقصدیت کا شکار یہ کردار زندگی کی مہملیت کو سہنے پر مجبور ہیں۔

عمر بھر کی مجبوریاں، رسوایاں، حاصل اور لاحاصل کی جستجو، بند گلیوں اور دروازوں کو کھٹکھٹانے کا عمل زندگی کی جبریت، فرد کے اندر نہ صرف وجودیاتی کرب پیدا کرتی ہے بلکہ فرد کے اندر گھن اور کراہت کے احساس کو بھی اجاگر کرتی ہے

## ہ۔ گھن اور کراہت

زندگی کی کرخت آمیز کیفیات جن میں غربت، بھوک افلاس کے حوالے سے انسان کی مجبوریاں، محرومیاں، انسانی جدوجہد کے بے ثمر ہو جانے اور اس کے نتیجے میں اکتاہٹ آمیز رویے انسانی بے حسی، ظلم، جبر، بے سمتیت، لامقصدیت انسان کے اندر گھن اور کراہت کے احساس کو ابھارتی ہیں۔ اور زندگی کے لزج ہونے کا احساس پیدا کرتی ہیں بقول سارتر:

> "زندگی لزج ہے جو فرد کی ذات کو نگلنا چاہتی ہے کیونکہ زندگی اپنے اطوار میں ایک جمود و سکوت اور یکسانی کی حامل ہے۔ یہ فرد کو اس جمود و سکوت کے رنگ میں رنگنا چاہتی ہے۔ یہ دنیا ایک "جونک ہے جو فرد کو چمٹی ہوئی ہے۔ (۳۶)

ہیزل ای برنس کے بقول:

> "وجود واقعیت اور ناگہانیت کا جو ذائقہ محسوس کرتا ہے وہی گھن ہے۔ ایک بے کیف اور ناگزیر گھن ہمیشہ میرے جسم کو میرے شعور کے سامنے منکشف کرتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر گھن تمام مادی تجربی کراہتوں کو جنم دیتی ہے۔ (۳۷)

بیسویں صدی کی گنجلک صورتحال نے فرد کو کو جمود اور یکسانیت کا احساس دلایا۔زندگی کی کرختگیوں نے جہاں فرد کو داخلی سطح پر کرب کا شکار کیا وہی فرد زندگی کی لزوجت سے بھی آشنا ہوا۔اور نتیجا فرد کے اندر ن ،کراہت، متلی۔جمود و سکوت جیسے جذبات امنڈنے لگے۔فرد کو دنیا اور اس کے معروض بے حد گھناؤنے اور مکروہ محسوس ہونے لگے۔فرد کی کراہت اور گھن کا اظہار انتظار حسین کے تقریبا سبھی افسانوں میں ملتا ہے۔"آخری آدمی "لالچ اور مکر میں آکر الیاسف کا بندر بننا،اپنے اور ہم جنسوں کے وجود سے اکتاہٹ اور گھن محسوس کرنا لزوجیت کے احساس کو اجاگر کرتی ہے۔

> "الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبھوکا صورتوں اور کھڑی دموں کا دیکھ کر ہنسا۔۔۔۔۔مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا۔۔۔۔۔الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔الیاسف محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے ،رونے اور ہنسنے سے،ہر کیفیت سے گزر گیا اور اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔"(۳۸)

یہاں الیاسف کی اپنے ہم جنسوں اور دنیا کی ہر آسائش سے بیزاری اور اکتاہٹ دکھاتا ہے۔یہ صورتحال افسانے میں گھن اور کراہت کا احساس کو اجاگر کرنے کا باعث ہے۔آدمی سے بندر کی جون میں آنانہ صرف کراہت انگیز صورتحال ہے بلکہ اس سے زندگی کی لزوجت کا بھی احساس ہوتا ہے۔زرد کتے اور کایا کلپ میں میں بھی اسی صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔"زرد کتا" میں انسانی نفس کے لئے "کتا" اور "لومڑی" جیسی علامات گھن اور کراہت کا احساس پیدا کر رہی ہیں۔پورے افسانے میں شروع سے آخر تک یہ احساس حاوی رہتا ہے۔ابولا قاسم پر دنیا کے عفویت زدہ ہونے کا احساس اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ اسے دنیا اور معروض دونوں گھناؤنے اور مکروہ محسوس ہونے لگتے ہیں جہاں تک کہ وہ دنیا سے کٹ کر اپنے عروضی صداقت کی تلاش میں جنگل کی طرف نکل جاتا ہے:

> "میں چلتے چلتے دور نکل گیا۔یہاں تک کہ میرا دم پھول گیا اور میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے، مگر پھر ایسا ہوا کہ اچانک میرے حلق سے کوئی چیز زور کر کے باہر آگئی اور پیروں پر گر گئی۔میں نے اپنے پیروں پر نظر کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک لومڑی کا بچہ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔تب میں نے اسے پیروں پر لاند کر کچل دینا چاہا اور وہ لومڑی کا بچہ پھول

> کر موٹا ہو گیا۔تب میں نے اسے قدموں سے کھونداا ور وہ موٹا ہوتا گیااور موٹا ہوتے ہوتے زرد کتا بن گیا۔تب میں نے پوری قوت سے زرد کتے کو ٹھوکر ماری اور اسے قدموں سے روندتا ہوا آگے نکل گیا۔(۳۹)

یہاں کہانی کا مرکزی کردار اس ساری امتلا آمیز کیفیت سے خود کو نکالنے کی کوشش میں سر گرداں ہے۔یہاں زرد کتا صرف نفس کے لئے ہی نہیں بلکہ دنیا میں موجود تمام دیگر برائیوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔بقول ابو قاسم خضری:

> "اے ابو قاسم خضری یہاں سے چل کہ یہاں تیرے باہر اور اندر زرد کتے پیدا ہو گئے اور تیرا آرام چھن گیا ہے۔(۴۰)

یہ تمام صورتحال شدید وجودیاتی کرب کو بیان کرتی ہے۔کہانی کا کردار اس کرب سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے مگر زندگی کی لزوجت ختم ہونے میں نہیں آتی۔زندگی کی لغویت اسے اپنے حصار میں مقید رکھتی ہے۔

"ہڈیوں کا ڈھانچ "افسانہ زندگی کی بے توقیری اور زندگی کی لزج آمیز صورتحال کا بیان ہے۔زندگی کے بے مایا اور بے وقت ہونے کا احساس پوری کہانی میں نمایاں ہے۔مر کر جی اٹھنے والا شخص ہر طرف سے آنے والا کھانا ہڑپ کر جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ کتے سے بھی کھانا چھین کر کھا جاتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> "وہ شخص جو مر کر جی اٹھا تھا ایک روز بازا سے گزرتا تھا کہ ایک کتے سے جو بڑے انہاک سے گوشت سے بھری ایک ہڈی کو چچوڑ رہا تھا مڈبھیڑ ہو گئی۔کتے نے پہلے تو دانت نکالے اور غرایا لیکن اس شخص نے جو مر کر جی اٹھا تھا جب خونخوار نظروں سے اسے دیکھا تو وہ دم دبا کر بھاگ گیا،اگرچہ دور کی گلی میں جا کر دیر سے بھونکتا رہا۔اس واقعہ سے لوگوں کی طبیعت ایسے منغض ہوئی کہ انہیں کھانے پینے کی چیزوں سے نجاست کا احساس رہنے لگا۔یہ نجاست کا احساس ان کے دل و دماغ میں اس طرح سمایا کہ وہ ہر چیز کو اس بھوکی ندیدی نظر سے بچا کر رکھنے کی کوشش کرتے۔(۴۱)

اسی طرح کہانی مین سانپ،چھپکلی،بلائیں اور سانسیے جیسی علامات متلی گھن اور کراہت انگیز کیفیت کو ابھارنے کا باعث ہیں۔

کایا کلپ میں شہزادہ آزاد بخت کی زندگی نہ صرف مہمل اور لغو ہے بلکہ امتلا انگیز بھی ہے۔زندگی کی اس امتلا انگیز صورتحال سے نجات حاصل کرنا چاہتا لیکن ناکام رہتا ہے۔زندگی کی اسی لزوجت کو سارتر نے اپنے "تصور امتلا" میں بیان کیا ہے۔آدمی سے مکھی کی جون میں آنا گھن کراہت اور متلی کے احساس کو پیدا کرتا ہے مثلاً:

"شہزادے کو شروع میں اایک خیال سا ہوا تھا کہ شاید اس کے اندر کہیں بہت گہرائی میں ایک ننھی مکھی بھنبھنا رہی ہے۔اس نے اسے وہم جانااور رد کر دیا۔ پھر رفتہ رفتہ اسے خیال ہوا کہ کہیں وہ سچ مچ مکھی نہ ہو۔تو مکھی میرے ااندر بھی پل رہی ہے؟اس خیال سے اسے بہت گھن آئی۔ جیسے وہ اپنی ذات میں نجاست کی پوٹ لئے پھر رہا ہو۔ جیسے اس کی ذات دودھ گھی تھی اور اب اس میں مکھی پڑھ گئی ہے۔ (۴۲)

بیسویں صدی میں وقت اور حالات کی واقعیت اور حقیقت پسندی نے فرد کو بے مایہ اور بے وقعت ہونے کا احساس دلایا۔ فرد کے اندر اکتاہٹ، حقارت، نفرت، حیرت، تشکیک اور حیرت کی ملی جلی کیفیات نے زندگی کی لغویت اور بے معنویت کو عیاں کیا۔اور یہی لایعنیت اور بے معنویت امتلا، گھن اور کراہت کا احساس اجاگر کرتی ہے۔

افسانہ سوت کے تار شہادت، ہمسفر، کٹا ہوا ڈبا، سیکنڈ راؤنڈ، سڑھیاں مردہ راکھ،، مشکوک لوگ، بگڑی گھڑی، دوسرا گناہ اور دوسرا راستہ اس قبیل کے دیگر افسانوں میں زندگی کی بے نام منزلیں، بے نشان آہٹیں حاصل اور لاحاصل کی جستجو، کھوئے ہوؤں کی تلاش وہ امکانات ہیں جو فرد کے اندر جمود اور یکسانیت کا باعث ہیں انسان وجودیاتی کرب میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ اس جمود کو توڑنے کی جہد کرتا ہے لیکن زندگی کی لزوجت ختم ہونے میں نہیں آتی۔اور انسان اکتاہٹ کا شکار ہو کر اپنی ذات سے بھی کٹتا چلا جاتا ہے اور اسکا اپنا وجود اس کے لیے ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔افسانہ دوسرا راستہ میں زندگی کی لزوجت کا احساس کچھ اس طرح ملتا ہے:

"ایہاالناس! اے لوگو! تم ایسے اونٹ پر سوار ہو جن کی باگیں تمہارے ہاتھوں میں نہیں سوار اور اونٹ دونوں سو رہے ہیں اور چل رہے ہیں، بے سمت بے منزل۔۔۔"(۴۳)

افسانہ اندھی گلی میں بے نام اور بے منزل راستے کی طرف بار بار جانااور بھٹکنا زندگی کی امتلا امیز صورتحال کو اجاگر کرتا ہے۔

اسی طرح افسانہ وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے میں یاجوج ماجوج کی لاحاصل اور بیکار کی کوشش اساطیری پیرائے میں موجودہ عہد کے انسان کے لئے بھی ایک المیہ ہے۔انسان ساری زندگی اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی جہد میں مصروف عمل رہتا ہے۔ لیکن زندگی کی تلخیاں اور حقیقتیں بار بار کسی دیوار کی صورت اس کے آگے آن کھڑی ہوتی ہے اور یہاں تک منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی موت آگھیرتی ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں موجود وجودیت کے تمام منفی عناصر کا وجودیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ انتظار حسین کے افسانوں میں انسان کی ذاتی زندگی اور اس کے مسائل،انسان کے ذہنی اضطراب، جذباتی ہیجان، رشتوں اور قدروں کی شکست وریخت، وجود کی گمشدگی جیسے اہم موضوعات وجودی فکر کا مرکز بنے ہیں۔اگلے باب میں انتظار حسین کے افسانوں کے حوالے سے وجودیت کے مثبت عناصر کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

# حوالہ جات


1. The Concept of anxiety, Soren Kierkegaard, in Edit and Translated by Rieder Thomte, p 79

۲۔ مجموعہ انتظار حسین، انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشن، ۲۰۰۷ء، ص، ۳۸۰

۳۔ ایضاً، ص، ۳۸۱

۴۔ ایضاً، ص ۳۹۱

۵۔ ایضاً، ص ۳۹۴

۶۔ ایضاً، ص ۴۱۲

۷۔ ایضاً، ص ۴۲۴

۸۔ ایضاً، ص ۴۸۳

۹۔ ایضاً، ص ۵۲۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۴۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۵۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۹۸

۱۳۔ اایضاً، ص ۶۴۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۷۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۲۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۸۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۹۲

۱۸۔ ایضاً، ص، ۵۴۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۴۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۷۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۹۲

۲۲۔ ایضاً، ص، ۴۸۳

۲۳۔ ایضاً، ص، ۵۴۷

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۵۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۹۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۰۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۷۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۷۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۸۳

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۰۱

۳۱۔ ایضاً، ص، ۴۴۰

۳۲۔ ایضاً، ص، ۴۵۶

۳۳۔ ایضاً، ص، ۴۶۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۶۱۵

۳۵۔ ایضاً، ص

۳۶۔ اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، افتخار بیگ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۳۱

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۳۸۔ مجموعہ انتظار حسین، انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۳۷۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۳۹۱۔ ۳۹۰

۴۰۔ ایضاً، ص ۳۴۰

۴۱۔ ایضاً، ص، ۴۰۵

۴۲۔ ایضاً، ص ۴۲۷۔ ۴۲۶

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۰۹

## باب سوم:

# انتظار حسین کے افسانوں میں وجودیت کے مثبت عناصر

(مذہبی اور اساطیری روایت کے پس منظر میں)

### الف۔ خود شناسی، آگہی ذات، انانیت

خود شناسی وجودی فلسفے کا انتہائی اہم عنصر ہے۔ اسلامی فلسفہ میں بھی اس بات کو سب سے زیادی اہمیت دی گئی ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے اور اس عالم وجود میں انسان خود شناسی کے ذریعے اپنے اپ کو بلند مقام پر پہنچائے جس کا وہ حقیقی حقدار ہے۔ اپنے آپ کو پہچان لینے کے بعد انسان مضبوط قوت ارادی کا مالک بن جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اخلاقی پستی میں گرانے سے بچاتا ہے، انسانی تقدس کو سمجھتا ہے، اپنی عقل اور مضبوط قوت ارادی کے ذریعے وہ حقیقی طور پر صاحب اختیار اور خود مختار بن جاتا ہے۔ بیرونی قوتوں کے اثرات سے نکل کر خود ہی اپنا حاکم بن کر اپنی ذات پر اختیار حاصل کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے میں بھی جگہ جگہ انسان کو خود شناسی کا درس دیا گیا اور یہ کہ انسان اس کائنات میں باقی تمام مخلوقات میں سے افضل ترین مخلوق ہونے کے ساتھ ساتھ آزاد اور خود مختیار ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدرت نے انسانی زندگی کے لیے کچھ ضابطے اور قوانین مقرر کر دئے گیے جن کی حدود میں رہتے ہوئے انسان اپنی زندگی گزارنے کا اہل ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے مفکروں نے جو فلسفہ متعارف کروایا اس فلسفے کا بنیادی مفہوم ہی انسانی وجود کی تلاش اور ہستی کا ثبات ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں فرد کرب، اذیت، خوف اور تنہائی کا شکار ہو کر اپنے من کی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہوا، اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں اپنی ذات کے حوالے سے بے شمار قسم کے سوالات سر اٹھانے لگے۔ وہ یہ سوچنے پت مجبور ہوا کہ انسان کی اصل شناخت کیا ہے؟ میں کون ہوں؟ میری ابتدا و انتہا کیا ہے؟ اس دنیا انسان کی تخلیق کا اصل مقصد کیا ہے؟ اس طرح کے بے شمار سوالات سے الجھتا ہوا انسان خود شناسی کے مقام تک پہنچتا ہے، اور یہی خود شناسی فرد کو انسانیت کے بلند مقام تک لے آتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان اپنی ذات سے آگاہی حاصل کر کے خدا کی ذات تک رسائی پاتا ہے۔ مذہبی وجودی فلاسفروں کے نزدیک بھی انسانیت کا اصل مقام و مرتبہ "خد عرفانی" ہے جو انسان کو خدا کی ذات تک لے جاتی ہے۔ ان کے نزدیک خالق اور

مخلوق کا رشتہ اصل میں تخلیق کا رشتہ ہے جس کی اساس آزادی ہے۔اور یہ کہ انسان اور خدا کا رشتہ جبری نہیں بلکہ یقین اور اعتماد کا حامل ہے۔خدا انسان کی موضوعیت کا لازمی جز ہے اور اس نے انسانی زندگی کے حوالے سے کچھ معیارات اور ضابطے مقرر کئے ہیں جن کی حدود میں رہتے ہوئے انسان اس پوری کائنات میں برتر و یگانہ ٹھہرا۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں ہونے والی سیاسی و سماجی ابتری اور اقدار کی شکست وریخت نے نے انسان کو نہ صرف خود سے دور کیا بلکہ وہ خدا اور مذہب سے بھی بیگانہ ہو گیا۔وجودیت نے لایعنیت کے گرداب میں پھنسے انسان کو باہر نکال کر اس کی ذات کا یقیں اور وعتماد بحال کیا۔اور یوں فرد اپنے آپ کو زندگی کے مثبت دھارے کی طرف لانے پر آمادہ ہوا۔

اگر دیکھا جائے تو وجودیت دہری ہو یا مذہبی دونوں میں "خود شناسی و خود آگہی" کے عنصر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔دہری وجودیت کے قائل بھی اس بات پر آمادہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو پہچان لینے کے بعد ہی اس کائنات اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کو واضح کر سکتا ہے۔جیسا کہ کامیو کے خیال میں:

> "یہ دنیا لغو ہے،فرد مکمل طور پر آزاد ہے،انسان تنہا ہے اور اسے ایک مسلسل جدوجہد کا سامنا ہے،انسان خود اعتمادی اور استواریت کے سہارے ہی اپنی زندگی کو روشن تر بنانے کا اہل ہو سکتا ہے۔"[۱]

اسی طرح سارتر فرد کے اس رویے کو انسان دوستی کے ساتھ موسوم کرتا ہے۔اس کے نزدیک:

> "اس کے نزدیک انسان اپنی داخلیت کی بے کرانیوں کے حوالے سے عظیم تر ٹھہرتا ہے"۔(۲)

بیسویں صدی میں ہمارے ہاں تخلیق ہونے والے ادب میں (ناول،افسانہ،شاعری) میں وجودی فلسفے کو بنیادی اہمیت دی گئی۔وجودی افسانہ نگاروں کی فہرست میں انتظار حسین کے افسانوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں کی فہرست بہت طویل ہے جن مین وہ عصر حاصر کے انسان کی داخلی و باطنی کیفیتوں،الجھنوں اور اضطراب کو تخلیقی لگن کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔اور فہم وادراک کے سہارے حیات و کائنات کی نوعیت اور مسائل کو اساطیری داستانوں،مذہبی حکایتوں اور قدیم دیومالائی قصوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔

داخلیت کا عنصر جو وجودیت کا اہم عنصر ہے، انتظار حسین کے ہاں مرکزی اہمیت کا حامل ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں کے کردار شدید داخلی کرب میں مبتلا ہو کر اپنے من کی بے کرانیوں میں غوطہ زن دکھائی دیتے ہیں۔ انتظار حسین کے ابتدائی دور کے افسانوں کے بیشتر کردار سیاسی جبر اور دباؤ کے زیر اثر زندگی گزارتے ہوئے بھی امید و یقین کا دامن پکڑے چپ چاپ ان راہوں پر محو سفر ہیں جس کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں ہوتا۔

تنہائی خوف اور کرب کے حصار میں ہونے کے باوجود انسان اپنی ہستی کا متلاشی رہتا ہے۔ جیسا کہ "آخری آدمی" میں الیاسف جو وقت اور حالات کے دھارے میں استوریت کے ساتھ ڈٹا رہتا ہے، بے بسی، بے چینی، غم غصہ اور خوف کی کیفیت میں اپنی ذات کی بھرپور تکمیل کے لئے کوشاں ہے۔ معاشرتی تبدیلیوں اور اخلاقی زوال کے باعث بستی کے تمام انسان حیوانی سطح پر اتر آتے ہیں، ایسی صورتحال میں الیاسف آخر وقت تک اپنی خود کی شناخت کو برقرار رکھنے کی جہد میں مصروف ہے۔ آخر وقت میں خوف کے زیر اثر رہتے ہوئے اسے اپنے اصل مقام و مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ کی بیشک اس نے خدا کے حکم سے روگردانی کی اور انسانیت کے اصل مقام سے گر گیا۔

> "اور الیاسف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ کیا وہ مکر میں گھر گیا ہے اس گھڑی اسے اپنی پوری ہستی ایک مکر نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے توں نے مجھے ایسا پیدا کیا جیسا پیدا کرنے کا حق ہے تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے کیا اب تو مجھ سے مکر کرے گا اور مجھے ذلیل بندروں کے اسلوب پر ڈھالے گا۔ (۳)

انتظار حسین کا افسانہ " زرد کتا' بھی اسی قبیل کا افسانہ ہے، نفس امارہ سے جنگ اور آدمی کی جون میں باقی رہنے کی جہد راوی کو خود آگہی اور خود اعتمادی کی منزلوں سے گزارتی ہے۔ حرص، لالچ اور طمع ایسی اخلاقی برائیاں ہیں جن سے بچ نکلنا آدمی کے لئے محال ہے، جیسے کہ راوی کے نزدیک:

> "جب سب زرد کتے بن جائیں تو آدمی بنے رہنا کتے سے بھی بدتر ہوتا ہے اور میں فریاد کرتا ہوں کہ اے پالنے والے میں کب تک درختوں کے سائے میں بنی آدم سے دور دور پھروں اور کچے پکے پھلوں اور موٹے ٹاٹ کی گدڑی پر گزارا کروں اور پھر میرے قدم شہر کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ (۴)

کہانی میں تمام کردار نفس امارہ کی زد میں آکر روحانی انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کہانی کا آخری کرداد اپنی ذات کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے آخر وقت تک نفس پر چھائی بدی اور برائی کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ دنیا کی ظاہری چکا چوند، خوبصورتی اور چہل پہل اسکے راستے کی رکاوٹ بنتی ہے، مگر شیخ کے کہے گئے الفاظ اسکے داخل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسے میں بے بسی او رخود اذیتی کی کیفیت میں وہ اپنے ہونے کے احساس کو زندہ رکھنے کے لیے اللہ سے رجوع کرتا ہے، اور موجودہ صورت حال کو قبول کرنے کے بجائے زندگی کے روشن رخ کا خواہش مند ٹھہرتا ہے۔ اور پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اللہ سے مخاطب ہوتا ہے:

"میرا دل اندوہ سے بھرا ہوا تھا اور میں نے دعا کی کہ بار الٰہا مجھے آرام دے، آرام دے، آرام دے۔ میں نے رات بھر دعا کی اور دریا کی طرف دیکھا کیا اور رات بھر غبار آلود تیز ہازرد رو پیڑوں کے درمیان چلا کی اور رات بھر درختوں سے پتے گرا کیے۔۔۔ پر جب تڑکا ہوا تو مجھے اپنے پوروں مین میٹھا میٹھا رس گھولتا گھلتا محسوس ہوا جیسے وہ صندل کی تختی سے چھو گئے ہوں، جیسے انہوں نے گول سنہری پیالے اور نرم نرم چاند سی ساقوں کو۔ [۵]

زندگی کی واقعیت نگاری اور صورتحال فرد کے اندر جذبوں کی ہلچل پیدا کرتی ہے اور فرد کے اندر یہ صدا گونجتی ہے کہ "ابھی میں ہوں"۔ یہاں فرد "اپنے ہونے" پر مصر ہوتا ہے۔ اور یہی آگہی فرد کو اثبات ذات سے روشناس کرتا ہے۔ افسانہ پر "چھائیں" فرد کے من میں پیدا ہونے والی جذبی بیقراری کا مکمل اظہار ہے۔ افسانے کا کردار بیسویں صدی کی بے چینی اور بے اطمینانی میں اپنی ذات کے مرکز سے کٹ کر رہ گیا اور اب اپنی ذات کے اثبات کے لئے اپنی ہی پر چھائیوں کے تعاقب میں ہے۔:

" قافلہ جو گزر گیا اور پر چھائیاں جو بھٹک رہی ہیں۔ ہم کس گزرے قافلے کی پر چھائیاں ہیں۔ میں بھے بھٹکتی پر چھائیوں کے قافلے میں سے ایک بھٹکتی پر چھائیں۔ میں کس وہم کی سوچ میں ہوں؟ میں ہوں! ہر چند کہ ہوں، نہیں ہوں۔۔۔ [۶]

اس طرح کے سوالوں سے الجھتا ہوا انسان اپنے موضوعیت کی جانب مائل ہوتا ہے۔ اور موضوعیت کے سہارے وہ زندگی کے حوالے سے فیصلے کرنے کا خود کو اہل پاتا ہے۔ "کایا کلپ میں "شہزادہ آزاد بخت وقت اور حالات کی

جبریت میں اپنی ذات کی نفی ہوتے دیکھتا ہے تو شدید وجودیاتی کرب میں بھی اپنے اپنی ذات کے اثبات کے لئے کوشاں ہے لیکن سیاسی و سماجی جبریت اور اخلاقی سطح پر رویوں کی شکستگی اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں:

"اس کے تصور میں جالا پھیلنے لگا اور اس نے سوچا کہ میرا باپ کون تھا۔ وہ سوچ کر حیران ہوا کہ باپ اس کا کون تھا کہ اسکا نام اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ عجب ہوا کہ جب اس نے سوچا تو وہ اپنا نام بھول گیا۔ تب وہ پریشان ہوا اور یاد کرنے لگا کہ نام اس کا کیا ہے؟ نام؟ س نے کہا حقیقت کی کنجی ہے، میری حقیقت کی کنجی کہاں ہے؟"(۷)

افسانہ ٹانگیں میں لِیس کا کرداد فطری ی کردار ہے جو اپنے ضمیر پر کی آواز پر کان دھرتا ہے اور خارج کی تمام برائیوں سے خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔۔ جبکہ افسانے کے دیگر کردار جو اپنی خواہشات کے دباؤ کے زیر اثر اخلاقی پستی کا شکار ہیں۔ "ہمسفر" میں بس کے سفر کو زندگی کے سفر کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ انسان زندگی میں بعض اوقات غلط راہوں کی طرف چل نکلتا ہے، ایسے راستے جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ زندگی کا یہ بے مقصد سفر انتہائی کھٹن واقعہ ہوتا ہے۔ راستے میں پیش آنے والی مشکلات سے گھبرا کر فرد اپنے موضوعیت کی جانب مائل ہوتا ہے اور یوں اس پر آگہی زات کے در واہوتے چلے جاتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس کا جی چاہا کہ وہ کھڑا ہو کر ان سے کہے کہ دوستوں ہم غلط بس میں سوار ہو گئے ہیں۔ مگر اسے فورا خیال آیا کہ وہ کہے گا تو کتنا بے وقوف بنایا جائے گا۔ غلط بس میں تو وہ سوار ہے۔ باقی سواریاں صحیح سوار ہوئی ہیں۔ تو ایک ہی بس بیک وقت صحیح بھی ہوتی ہے، غلط بھی ہوتی ہے؟ ایک ہی بس غلط راستے پر بھی چلتی ہے اور صحیح راستے پر بھی چلتی ہے؟ یہ صورتحال اسے عجیب لگی اور اس نے اس کے ذہن پر اچھے خاصے ایک مابعدالطبیعاتی سوال کی شکل اختیار کر لی۔ پھر اس نے اس گھتی کو یوں سلجھایا کہ بس کوئی غلط نہیں ہوتی۔ بسوں کے تو راستے اور سٹاپ اور ٹرمینس مقرر ہیں۔ سب بسیں اپنے اپنے راستوں پر رواں دواں ہیں۔ غلط اور صحیح مسافر ہوتے ہیں۔(۸)

اسی طرح شہادت کا کردار بھی من میں گھرے سولات سے الجھتا نظر آتا ہے اور اپنے ہونے کے توسط سے ذات کی آگہی چاہتا ہے مثلاً:

"میں شہادت دیتا ہوں اس لیے میں ہوں مگر حق بھی کیا میری شہادت کا محتاج ہے ؟اس کے ذہن میں ایک اور سوال پیدا ہوا۔ سچائی اظہار کی کیوں طالب ہے اور شہادت کی کیوں محتاج ہے ؟اور سچائی خود کیا ہے۔؟ اپنے نام کا اعلان اس وقت لاری میں کیوں سچائی کا اظہار تھا اور اب کیوں نہیں ہے۔۔۔"(۹)

یہاں فرد تلاش آگہی کے سفر میں ہلکان ہے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں ہے۔"وہ جو کھو گئے" "'شہر افسوس" سیڑھیاں اور کٹا ہوڈبا میں انسانی شناخت کے معدوم ہونے کا بیان ہے۔ان کہانیوں میں انتظار حسین نے تہذیبی فضا آفرینی کو برقرار رکھتے ہوئے بیک وقت ماضی حال اور مستقبل کا سفر کیا ہے۔ان کہانیوں کی فضا میں ہجرت کا المیہ فرد کو مسلسل کرب اور اذیت سے دوچار کرتا ہے۔"وہ جو کھو گئے " کے چاروں کردار اپنی ذات کے معدوم ہونے کے خوف میں مبتلا ہیں اور ہر ایک اپنی ذات کے اثبات کے لیے دوسرے کی گواہی کا طلب گار ہے۔کرب تنہائی اور اذیت کی کیفیت میں بھی چاروں کے اندر "ہونے "کا احساس غالب ہے۔اسی طرح افسانہ "سیڑھیاں" میں بشیر ،رضی اور اختر ماضی اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے میں پریشان ہیں۔افسانے کی فضا میں ایک مخصوص مذہبی، تہذیبی فضا کو بیان کیا گیا۔افسانے کے کردار خوابوں اور یادوں کے ذریعے اسی فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ ماضی کی یادیں اور خواب انہیں خود کی شناخت کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔"مردہ راکھ" میں بھی افسانے سیڑھیوں کی طرح مذہبی اور تہذیبی فضا کے پس پردہ اپنی سرزمین، اپنی جڑوں اور اپنی ذات سے کٹ جانے کے احساس کو ابھارا گیا ہے۔افسانے کے کردار آگہی کے اسی کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

"مولوی فرزند علی درد بھری آواز میں بولے: علم ہم نے کھو دیا اور دلدل کو ہم نے۔۔۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے' پھر بولے: "اب کہا رہ گیا ہے۔ نیکیاں رو گرداں ہو گئیں اور حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔سچ فرمایا تھا آپ نے،بہت سچ فرمایا تھا۔"مولوی فرزند علی کی آواز رقت سے کانپنے لگی تھی۔(۱۰)

"شرم الحرم اور کانا دجال میں تقسیم فلسطین کا تصور کرداروں کو بے چین رکھتا ہے۔فلسطین کی سرزمین اور مسجد اقصیٰ جو ہماری روحانی سیڑھی ہے کا چھن جانا ہمارے وجود کا ختم ہو جانا ہے۔افسانے کے کردار اسی سرزمیں پر ہونے

والے ظلم و ستم کے حوالے سے کرب میں مبتلا ہیں اور یہ کرب انہیں اگہی کے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ مکالمہ ملاحظہ ہو:

"چلتے چلتے وہ ٹھٹکے: "ہم کس طرف جاتے ہیں۔؟

"تاشقند کی طرف۔"

"تاشقند کیا؟۔۔۔۔تاشقند کیا؟"

"تاشقند، سمرقند، زہر خند، گوسفند۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پوچھا کہ ہمارے درمیان یہ تیسرا کون ہے اور کیا زبان بولتا ہے۔

میں کون ہوں؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔

اے اجنبی کیا تو ہم میں سے نہیں ہے؟

"اے شخص! کیا تو عجمی ہے؟"

"، میں؟ میں کون ہوں؟ کیا میں ان میں سے نہیں ہوں؟ میں کن میں سے ہوں؟ کہاں ہوں؟۔۔۔

۔۔۔مگر میں تو وہاں نہیں تھا۔۔۔"(۱۱)

من میں اٹھنے والے یہی سوالات فرد کو تلاش ذات پر اکساتے ہیں۔ زندگی کی واقعیت اور صورتحال کی بھینٹ چڑھ کر فرد اپنے آپ سے مکمل بیگانہ ہو جاتا ہے اور یہی بیگانگی فرد کو آگہی ذات سے آشنا کرتی ہے۔ اور فرد ماضی حال اور مستقبل کا سفر کرتے ہوئے اپنے اصل کی جانب مائل بہ ہوتا ہے۔:

"اس نے کروٹ لی اور سوچا: میں ماضی میں ہوں یا مستقبل میں ہوں۔ ماضی حال مستقبل، بیداری خواب سب کچھ گڈ مڈ تھا، جیسے وہ جاگ بھی رہا تھا اور سو بھی رہا تھا، جیسے وہ ماضی حال اور مستقبل کے منطقوں میں بکھرا پڑا تھا، تین سو تیرہ۔ یہ ہمارا ماضی ہے یا مستقبل؟ جو آغاز تھا وہی انجام بھی ہے۔ جہاں ہم بلند ہوئے تھے وہاں ہم پست ہو گئے۔ کاناد جال تاشے باجے کے ساتھ آئے گا۔ کاناد جال، کان کا میل، گدھا، گیہوں، امریکہ۔ میں ماضی ہوں یا حال میں ہوں۔(۱۲)

یہاں انتظار حسین نے مغربی سامراج کیے عزائم، عرب ممالک کی بے حسی کا پردہ چاک کرنے کے ساتھ عالم اسلام کو کرداروں کے زریعے خود احتسابی و خود شناسی کا درس دیا ہے۔یہی طرز فکر و احساس اقبال نے پیش کیا ہے، کہ عالم اسلام ماضی کی شان و شوکت اور اپنا کھویا ہو مقام واپس حاصل کرنے کی کوشش کرے۔اور ایسا تب تک ممکن ہے جب تک انسان اپنی خودی کو نہیں پالیتا۔افسانے میں کبوتر معرفت و تصوف کی علامت ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اماں جی اس طرح، جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، کہنے لگیں:"پورا خواب تو مجھے یاد نہیں ہے، کوئی کوئی بات یاد رہ گئی ہے، جیسے میں تمہارے ساتھ زیارت کے لیے گئی ہوں، جیسے خلقت امنڈی ہوئی ہے اور سفید سفید کبوتر صحن شریف میں، دیوار شریف پر، گنبد شریف پر۔پھر جانے کیا ہوا، کچھ یاد نہیں۔بس یہ یاد ہے کہ میں اکیلی ہوں اور کہہ رہی ہوں کہ اے ہے! کبوتر کہاں گئے؟ کوئی کبوتر ہی نہیں، صحن شریف میں بھی نہیں، دیوار شریف پر بھی نہیں اور گنبد شریف خالی پڑا ہے، پھر جیسے میں تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔(۱۳)

اسی طرح "شہر افسوس" میں زندگی کے جوکھم، اور اپنے وجود کی تلاش کا مسئلہ فرد کا بیقرار رکھتا ہے۔وہ خود اعتمادی اور اخود آگہی کے سہارے زندگی کے امکانات کی طرف رجوع بھی کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی زندگی کی لزوجت کا احساس بھی اس پر حاوی رہتا ہے زندگی کی یہی لزوجت فرد کو تلاش ذات پر اکساتی ہے۔اور آگہی سے جوش عمل اور جہد پر اکساتی ہے

## ب۔ جوش عمل اور جدوجہد

زندگی کے گونا گو مسائل اور مہملیت کے باوجود فرد وقت اور حالات کے دھارے میں مستقل مزاجی کے ساتھ ڈتا ہوا ہے۔وہ زندگی کی لزوجت سے خوف زدہ بھی ہے اور جہد سے بھرپور بھی ہے۔اپنے آپ کو منوانے کی خواہش اور اثبات ذات کا احساس فرد کو ہمیشہ فعال اور متحرک رکھتا ہے۔ایسے میں فرد نہ صرف سیاسی، سماجی اور معاشرتی طاقتوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے بلکہ اپنے داخل میں پیدا ہونے والی تمام منفی سوچوں کو شکست دینے کی

جہد میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اور اپنی ذات کے تحفظ کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔اور یہی "ہاتھ پاؤں مارنا" اسے زندگی عطا کرتا ہے کیونکہ زندگی مسلسل جہد اور جوش عمل سے عبارت ہے۔

فرد زندگی کے جمود اور سکوت کو کسی صورت قبول نہیں کرتا، خوف، خدشات، شکست کا ڈر ان تمام سے بے نیاز ہو کر فرد یقین اور اعتماد کے سہارے کے ساتھ جہد عمل نظر آتا ہے۔انیسویں اور بیسویں صدی میں فرد جہاں سیاسی، سماجی اور معاشرتی انتشار کا شکار ہے۔زندگی کی حقیقت پسندی اور موت کی کرختگی کے آگے بے بس ولاچار ہے وہی فرد زندگی کے ساتھ قربت اور وابستگی چاہتا ہے۔اور زندگی میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے مائل بہ عمل ہے۔اپنی ذات کے اثبات کے ساتھ ساتھ وہ اپنی اقدار کے اثبات کا بھی خواش مند ٹھہرتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے قائم ہونے سے تقسیم ہند تک اور ہجرت کے مسائل اور پاکستان کے بعد کے حالات وواقعات میں فرد جہاں داخلی سطح پر کرب، موت، تنہاہی، مایوسی، اکتاہٹ کا شکار ہوا وہیں وہیں فرد ان مسائل سے نبٹنے کے لئے مصروف و عمل نظر آتا ہے کبھی وہ حکمت و دانش سے کام لے کر موجودہ صورتحال سے خود کو نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے باغی بن جاتا ہے، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر منفی طاقتوں کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے ہر دور میں ادب میں جہد عمل اور یقین محکم کو بنیادی موضوع بنا کر فرد کو اسکی عظمت اور رفعت کا احساس دلایا ہے۔

وجودیت پسندوں کے ہاں فرد کی عظمت و رفعت ہی بنیادی نقطہ ہے اور یہ جوش عمل اور جہد کے بغیر ناممکن ہے۔انتظار حسین کے افسانوں کی بات کی جائے تو ان کے فسانوں کے کردار زندگی کی ناگہانی صورتحال میں کرب، مایوسی، اکتاہٹ، خوف اور تنہائی کا شکار ہیں۔حالات کے سامنے بے بس ولاچار ہیں لیکن اسکے باوجود اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کی جہد میں مصروف ہیں۔زندگی کی محدودیت بار بار آڑے آتی ہے لیکن اپنے وجود کو برقرار رکھنے خواہش جہد عمل پر اکساتی ہے۔دیکھا جائے تو انتظار حسین کے افسانوں کے کردار زندگی کی کشاکش سے خود کو نکالنے اور اپنی ذات کی تفہیم میں مگن ضرور ہیں، اور زندگی کے روشن رخ کو دیکھنے کے خواہش مند بھی۔انفرادیت اور آزادی کے قائل بھی ہیں لیکن وقعیت وحقیقت اور اپنے نفس پر حاوی برائیوں کے آگے ہار جاتے ہیں۔تنہائی بے بسی اور لاچاری کی کیفیت میں تمام انسانی کوششوں کے باوجود موجودہ صورتحال کو قبول کر لیتے ہیں۔جیسا کہ

الیاسف، شہزادہ آزاد بخت اور ابو قاسم خضری کا کردار جو اپنے آپ کو بچانے کے لیئے باطن کے ساتھ مسلسل جنگ لڑنے میں مصروف ہے۔ مثلاً:

"الیاسف اس قریئے کا آخری آدمی تھا۔اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔"(۱۴)

لیکن انسان کی فطرت میں بسی بدی اور برائی اس قدر حاوی ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی کوششیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے یہاں الیاسف کا کردار بھی لالچ اور فریب میں آکر باطن کے ساتھ جنگ لڑنے میں ناکام رہتا ہے۔

اسی طرح ابو قاسم خضری کا کردار جبلتی قوتوں کے دباؤ کے زیر اثر اپنی بکھرتی ذات کو بچانے کی جہد میں مصروف ہے۔ بے شمار رکاوٹیں اسکا راستہ روکتی ہیں لیکن وہ اپنے ذات کے تشخص کو برا قرار رکھنے کے لئے اپ نے ہم جنسوں سے کٹ کر جنگل کی طرف نکل جاتا ہے اور آخر وقت تک اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا اور تمام اندرونی و بیرونی طاقتوں کو شکست پر مامور کر دیتا ہے۔ راوی کے بقول:

"جب تڑکا ہو تو مجھے اپنی پوروٴں میں میٹھا میٹھا رس گھلتا ہوا محسوس ہوا جیسے وہ صندل کی تختی سے چھو گئے ہوں، جیسے انہوں نے گول سنہری پیالے اور نرم نرم چاندی سی ساقوں کو مس کیا ہو جیسے وہ صندل کی تختی سے چھو گئے ہوں، جیسے انہوں نے گول سنہری پیالے اور نرم نرم چاندی سی ساقوں کو مس کیا ہو، جیسے انگلیاں سونے چاندی سے کھیل رہی ہوں اور ان کے درمیان درہم دینار کھنک رہے ہوں۔"(۱۵)

افسانہ ٹانگیں اور ہڈیوں کا ڈھانچ بھی اسی احساس کے افسانے ہیں جن میں تمام تر انسانی کوششیں نفس کی طاقت کے سامنے شکست پر مامور ہیں، کرب آگہی فرد کو جوش اور ایقان بخشتا ہے جس کے بل بوتے پر فرد زندگی کے دھارے میں خود کو منوانے کی ٹھان لیتا ہے۔ مگر زمانے کی محدودیت کے آگے بے بس ہے۔

"آخری آدمی" کی تقریباً سبھی کہانیوں میں فرد اپنی ذات م اور اپنی روحانی اقدار روایات کی گمشدگی پر نوحہ کناں ہے اور ذات کی پرچھائیوں اور اقدار و روایات کے اثبات کے لئے کوشاں ہے۔ ایسے میں ہر لمحہ فرد کا تیقن اور اعتماد متزلزل ہوتا ہے لیکن کرب آگہی کے سہارے وہ زندگی کی کشاکش میں چپ چاپ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ شرم

الحرم اور کاناد جال میں کرادوروں اپنی جڑوں کی آبیاری کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔امت مسلمہ کو ظلم اور غلامی سے نکالنے کا جوش وجذبہ لیئے اپنے ضمیر کے ساتھ جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔

افسانہ سڑھیاں اور مردہ راکھ میں تحت الشعور میں پڑھی ماضی کی نرم اور میٹھی یادیں فرد کو تلاش ذات کے سفر پر روانہ کردیتی ہیں اور فرد ماضی کی ان یادوں کے سہارے موجودہ عہد کی کشاکش میں ذات کے اثبات کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے۔ "مشکوک لوگ" میں جھوٹ، فریب، بدکاری اور ریاکاری میں ایک انسان خود کو بچانے کی جھد میں مصروف ہے۔ یہاں اپنی ذات کے حوالے سے وہ شک اور وسوسہ میں مبتلا ہے کہ کہیں ریاکار اور جھوٹے کے ساتھ بیٹھنے سے وہ بھی ان برائیوں کا شکار تو نہیں ہو گیا۔ مثلا:

> "اسے یونہی اس آدمی کیا خیال آگیا کہ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے قریب سے اسے غور سے دیکھتے ہوئے گزرا تھا۔ عجیب بات ہے کہ دن میں کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھتا، رات میں ہر کوئی شک بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ کون تھا وہ۔؟ کون ؟اس کے دھیان نے پٹڑی بدلی اور وہ کافی ہاؤس میں چلا گیا۔ اگر وہ پامسٹ نہیں تھا تو پھر کون تھا؟۔۔اور میرے ہاتھ کا عکس۔۔۔اسکا دل ڈوبنے لگا مگر اس نے فوراہی جھر جھری لی۔ میں تو بلکل قاضی صاحب ہوتا جار ہو ہوں قاضی صاحب کے خیال سے اسے عجیب سا خیال آیا۔ اشتیاق، طفیل، حسنین، عارف، شفیق، سب کو ایک ایک کرکے وہ دھیان میں لایا۔ انہیں اور ان کی پتلیوں کو۔ان کی پتلیاں۔۔۔اس نے پھر جھر جھری لی۔ میں تو بلکل شفیق بنتا جارہا ہوں، اور اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کردیے۔"(۱۶)

"وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے" میں سد سکندری سے نکل کر بے آب وگیاہ زمینوں پر حکمرانی کرنے کا خواب قوم یاجوج ماجوج کے اندر عزم ہمت اور حوصلہ پیدا کرنے کا باعث ہے۔ قوم یاجوج ماجوج کا ساری رات سد سکندری کو چاٹنا ان کے ہمت و حوصلے اور خود پر اعتماد اور یقین کی دلیل ہے۔اپنی اس خواہش کو پوار کرنے کے لیے وہ مسلسل جہد وجہد میں ہے، اور دونوں قوموں انفرادیت کے چکر میں ایک ددوسرے کے خون کے پیاسے ہو جوتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> "جب پہاڑ سا دن کٹ گیا اور رات نے ڈیرہ کیا۔ تب یاجوج موجوج نے پھر اپنی زبانیں تیز کیں اور دیوار چاٹنی شروع کردی، اور ابھی رات باقی تھی کہ دیوار کے ڈھے جانے کی امید

لے کر شیریں چشمے سے سیر ابی کا تصور باندھ کر ال یاجوج اپنے پہاڑ سے نکلی اور آل ماجوج اپنے پہاڑ سے بر آمد ہوئی، انہوں نے پھر ایک دوسرے کا راستہ کاٹا اور آپس میں دست و گریباں ہوئے۔۔۔۔تب پھر یاجوج نے ماجوج پر دانت کچکچائے اور کہا کہ میں تمہیں اور تیری آل کو یوں چاٹوں گا۔ جیسے سد کندری کو چاٹتا ہوں اور یاجوج نے ماجوج پر زبان تیز کی اور چلایا کہ میں سد سکندری کو بعد میں چاٹوں گا اور تیری ال کو پہلے چاٹوں گا، اور شام پڑے وہ پھر ایک دوسرے کو چاٹنے لگے اور چاٹتے ہی چلے گئے، حتی کہ ان کہ دونوں انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گئے، امفراب ان کی زبانیں اینٹھ چکی تھیں اور آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ (۱۷)

یہاں دونوں قومیں ہار جیت سے بے نیاز ہو کر اپس میں گتھم گتھا ہیں اور مستقبل کے حوالے سے جوش سے بھرپور بھی ہیں۔ لیکن ان کی کوششیں آخر کار بے معنی ثابت ہوتی ہیں۔

## ج۔ حریت (تصور آزادی)

آزادی انسان کا بنیادی حق ہے، اور وجودی فلسفے کا بنیادی مقصد ہی انسان کی کامل آزادی ہے۔ وجودی فلسفیوں کے نزدیک فرد کا وجود معتبر وجود ہے، انتخاب فیصلہ،، عزم، آزادی اور امکانات سے فرد کا وجود مالا مال ہے۔ اور یہ کہ انسان اس دنیا میں اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ فرد اپنی اسی بے پایاں آزدای کو بروئے کار لاتے ہوئے موضوعیت کے سہارے اپنی کھوئی ہوئی ذات کو واپس لا سکتا ہے۔ اس نقطے پر پہنچ کر وجودیت پسندوں کے افکار میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے مذہبی وجودیت پسندوں کے نزدیک انسان آزار اور مختار مخلوق تو ہیں لیکن انسان کے ذمے کچھ فرائض، ذمہ داریاں اور حدود و قیود بھی مقرر ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے فرانتخاب عمل کر سکتا ہے۔ لیکن لادینی مفکروں کے نزدیک انسان ہر طرح سے آزاد ہے۔

اس کی مرضی ہے کہ وہ اپنے فرائض کو پورا کرے یا نہ کرے۔ جیسا کہ سارتر کا کہنا ہے کہ خدا کہ ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ خدا کی غیر موجودگی میں ایک اصل انسان ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان اس دنیا میں بے یار و مددگار پھینک دیا گیا ہے اور دنیا میں اس کے لیے جگہ جگہ محرومیاں اور ناکامیاں ہے اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو کیسے بنائے، آدمی اس کے سوا کچھ نہیں جو وہ اپنے اپ کو بناتا ہے۔ اس کی مرضی

ہے کہ وا پنے لیے درست کا انتخاب کرتا ہے یا غلط کا انتخاب کرتا ہے۔ اسلام یں جہاں فرد کو انتخاب واختیار کی آزادی دی گئی ہے وہیں فرد کے سامنے دو طرح کے راستے رکھ دیئے ہیں، غلط اور صحیح کا راستہ اور ساتھ ہی سزا و جزا بھی مقرر کردی گئی۔ لیکن اختیار فرد کے سپرد کیا گیا ہے اور اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ فرد اپنے لئے کون سے راستے کا انتخاب کرتا ہے۔

وجودی فکر ایک ایسے دور میں پروان چڑھی جب فرد اپنے ہی بنائے گئے دام میں جکڑ کر رہ گیا، ٹیکنالوجی، سائنس، مشینی زندگی، سیاسی و سماجی تنظیمیں اور ان کی اجارہ دارہی یہ وہ تمام عوامل ہیں جن کے گھن چکر میں پھنس کر فرد اپنے آپ کو بھول گیا، انفرادیت کی جگہ اجتماعیت نے لے لی۔ فرد اس قابل ہی نہیں رہا کہ وہ اپنی موضوعیت اور آزادی کے لئے کچھ کر سکے۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہب کی غلامی نے فرد کی آزادی کو سلب کر لیا۔ ایسے میں وجودی فلسفیوں نے فرد کی آزادی کے تصور کو اپنی وجودی فکر میں پیش کیا، اور اجتماعیت کے دائرے میں معدوم ہوتے فرد کی ذات کے اثبات کے لیے آواز اٹھائی۔

اپنی ذات کے اثبات، انفرادیت اور اپنے آپ کو منوانے کے لیے ہر لمحہ سر گرداں ہے۔ ایسے میں وہ اپنے راستے میں حائل تمام رکاوٹوں کے خلاف بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور موضوعیت کے سہارے زندگی کی تمام حدود و قیود کو پھلانگتے ہوئے صحیح اور غلط کو بی نہیں دیکھتا۔ زندگی کی احساس محرومیاں، فرسودہ رسوم رواج، غلامی، جبریت فرد کو حریت پر اکساتے ہیں۔ اور فرد پرانے اقدار و نظریات، رسوم و رواج کو شکست دے کر اپنے لیے زندگی کی نئی راہوں کا انتخاب کرتا ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں جہاں زندگی جمود اور سکوت کا شکار تھی وہی فرد کے اندر حریت کے تصور نے فرد کو جامد اور ساکت زندگی سے نکلنے کا رستہ دکھایا، کہ فرد اپنے لیے روشن راہوں کا انتخاب کر سکے۔

انتظار حسین کے افسانوں کی بات کی جائے تو افسانوں کے کردار موضوعی رویوں کے حوالے سے اپنے آپ کو منوانے کے لیے سر گرداں ہیں ہیں، لیکن عملی طور پر بغاوت کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ کردار موجودہ صورتحال پر اندر ہی ندر غم و غصے کی کیفیت میں کڑھتے نظر آتے ہیں، واقعیت اور حقیت کے سامنے بے بس و لاچار ہیں، موجودہ حالات کی نفی اور دوسروں سے الگ دکھنے کی خواہش لئے چپ چاپ محو سفر ہیں۔ افسانہ کایا کلپ میں شہزادہ آزاد

بخت اپنے آپ کو دیو کی قید سے خود کو نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ آزادی کا خواہش مند ہے لیکن اس کی تمام کوششیں ناکام ٹھہرتی ہیں، لہذا وہ متعلقہ صورتحال کو قبول کر لیتا ہے:

> "شہزادے نے جب یہ جانا کہ وہ رات کو مکھی بن جاتا ہے اور ایک عورت اس کی جان بچانے کے لئے یہ جتن کرتی ہے تو اس کی مردانہ غیرت نے جوش کھایا اور اس بات کو اپنی آدمیت اور شجاعت پر حرف جا۔ وہ یہ سوچ کر انگاروں پر لوٹنے لگا کہ اے آزاد بخت تجھے اپنی عالی نسبی، اپنی ہمت و شجاعت اور اپنے علم و ہنر پر بہت گھمنڈ تھا آج تیرا گھمنڈ خاک میں ملا کہ ایک غیر جنس تیری جنس پر حکومت کرتا ہے اور ستم توڑتا ہے اور تو حقیر جان کی خاطر دنیا کی سب سے حقیر مخلوق بن گیا۔ [۱۸]

انتظار حسین کا یہ افسانہ اساطیری پیرائے میں موجودہ عہد کے لئے بطور علامتی افسانہ ہے۔ دیو اور قلعہ یہاں سامراجی طاقتوں اور تخت و تاج کے بطور علامت کے استعمال ہوئے ہیں۔ شہزادے کا کردار بطور ایسے حکمران کے استعمال ہوا ہے جو آزادی کی خواہش تو رکھتے ہیں لیکن عملی طور پر آزادی کے لے جہد کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

اسی طرح آخری آدمی کے تقریباً سبھی افسانوں کے کرادار اندر ہی اندر تشکیک، بے چینی اور بے یقینی کی کیفیت میں موجودی صورتحال سے آزادی حاصل کرنے کی جہد میں مگن نظر آتے ہیں۔

افسانہ شرم الحرم اور کانا دجال کے کرادر اندر ہی اندر اپنے ہی ضمیر کے ساتھ جنگ لڑنے میں مصروف ہیں، آزادی کے خواہشمند ہیں اور اپنی جڑوں کی آبیاری کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ افسانہ دوسرا راستہ سیاسی جبر کی کہانی ہے۔۔ افسانے کا مرکزی کردار بس میں بیٹھے لوگوں کے ساتھ سیاسی حالات بیان کرتا نظر آتا ہے اور سیاسی حالات واقعات پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے:

> "اے میرے بھائیو! عرصہ گزر گیا انصاف مانگتے مانگتے۔ انصاف، احتساب، یاد کرو حضرت عمر فاروق کے کرتے پر اعتراض مگر جہاں مسلمان آزاد نہ ہو، وہاں شہ زور بھی کمزور ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ تڑپنے کے سوا، جیسے محمد علی کلے۔۔۔ [۱۹]

افسانہ "وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے" میں قوم یاجوج ماجوج کا جوش عمل اور اور بے آب و گیاہ زمینوں پر حکمرانی کے خواب ان کے اندر حریت کے جذبے کو بیدار کرتے ہیں، اور وہ اس قید سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد میں مگن ہو جاتے ہیں۔

حسین کے افسانوں میں جہاں وجودیت کے منفی عناصر مختلف صورتوں میں موجود ہیں وہاں وجودیت کے مثبت عناصر بھی مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ان کی کہانیوں میں موجود فرد حزن و یاس سے خوشی و مسرت کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔احساس محرومی فرد کو ہمہ وقت خدا کی ذات سے قریب رکھتی ہے۔آگہی ذات کے ساتھ ساتھ فرد کا خدا کی ذات پر یقین پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔زندگی کی معنویت کا احساس اس کے نزدیک مزید پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔کرداروں کا یہ احساس کہ آنے والے دن خوش آئند ہو گا، مصیبتیں ٹل جائیں گی۔وہ حال کے مسائل سے تنگ آکر آئندہ زندگی میں خوشحالی کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔مذکورہ تحقیق سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ انتظار حسین کے افسانوں میں وجودیت کے مثبت ایسے مثبت عناصر ضرور موجود ہیں جو وجودیت کے مثبت رویے کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

# حوالہ جات


۱۔ قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۹۹

۲۔ ژال پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، مترجم قاضی جاوید، عثمان بلاک نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

۳۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۷۹

۴۔ ایضاً، ص ۳۹۱

۵۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۶۔ ایضاً، ص ۴۰۱

۷۔ ایضاً، ص ۴۲۶

۸۔ ایضاً، ص ۴۱۸

۹۔ ایضاً، ص ۴۶۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۲۲

۱۱۔ ایضاً، ۵۴۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۵۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۵۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۷۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۱۶۔ ایضاً ص ۵۳۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۹۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۲۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۶۷

## چوتھا باب:

# انتظار حسین کے افسانوں پر کافکائی وجودیت کے اثرات

(کافکا کا افسانہ اور وجودیت: مختصر جائزہ)

## الف۔ کافکائی وجودیت

بیسویں صدی کے وجودی فلاسفروں میں سے ایک انتہائی اہم نام کافکا کا ہے۔ کافکا اپنے دور کا ایک اچھا ناول نگار اور افسانہ نگار تھا۔ کافکا کے ادبی کردار اور اس کی شخصیت کو جاننے کے لئے محمد عاصم بٹ کی کتاب "کافکا کہانیاں" نیر مسعود کی کتاب "کافکا کے افسانے" سہیل احمد کی کتاب "طرزیں" اور اوراق سبز میں سلیم سہیل کی شامل ہونے والی تحریر "فرانز کافکا" کو بنیادی ماخذات کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان ماخذات میں دستیاب معلومات کی بنیاد پر کافکا کی افسانہ نگاری کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

کافکا اپنے دور کا ایک اچھا ناول نگار اور افسانہ نگار تھا۔ ناقدین ادب اور تجزیہ نگار کافکا کی تحریروں کو عالمی ادب کا انتہائی اہم کارنامہ سمجھتے ہیں۔ کافکا نے اپنی تحرووں میں بیسویں صدی کی سیاسی و سماجی کشمکش، فرد کی داخلی زندگی، لایعنی رویوں کو موضوع بنایا ہے۔ کافکا نے اپنی تحریروں میں بیسویں صدی کے ہجوم میں گم ہوتے فرد کو تلاش کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ کافکا کی تحریروں میں بیگانگی، لایعنیت، خوف، تشکیک اور تنہائی جیسے احساسات کو کربناک اظہار ملتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو کافکا کو اپنی زندگی میں بھی بے شمار تکالیف، مصائب اور مشکلات کا سامنا رہا۔ کافکا کا بچپن تنہائی اور اکیلے پن میں بسر ہوا والدین کی طرف سے توجہ نہ ملنے کی وجہ سے اور اس پر مستزاد والد کے تند اور جارحانہ رویے نے کافکا کے اندر خوف اور عدم تحفظ کے احساس کو جنم دیا۔

بظاہر کافکا ایک پر اعتماد شخص تھا لیکن اپنے باپ کے سامنے بات کرتے ہوئے ہچکچانے لگتا۔ اس کے تعلقات ساری زندگی اپنے باپ کے ساتھ بہتر نہ ہو سکے یہی وجہ تھی کہ ساری زندگی وہ تنہائی اور ذہنی کشمکش کا شکار رہا۔ اپنی باطن کی کشمکش اور کیفیات کا اظہار وہ اپنی چھوٹی موٹی تحریروں میں کیا کرتا اور ان تحریروں کو وہ سب سے چھپا کر رکھا کرتا تھا۔

کافکا نے کم عمری میں ہی لکھنے کا آغاز کر دیا دیا۔ لیکن اس نے اپنے بچپن میں لکھی جانے والی تحریروں کو غیر اہم قرار دے کر خود ہی مسترد کر دیا۔ کافکا کی تمام تمام چھوٹی موٹی تحریریں، محبوبہ کو لکھے جانے والے خطوط اور بعد کی کہانیاں اس کی تنہائی، احساس محرومی، تکالیف، کرب، دکھ اور اندرونی کشمکش کی عکاس ہیں۔ کافکا نے قانون کی تعلیم حاصل کی لیکن اس نے وکالت کو پیشے کے طور پر کبھی نہیں اپنایا بلکہ کافکا نے ایک بیمہ کمپنی میں بطور افسر ملازمت کی۔ اس حوالے سے نیر مسعود لکھتے ہیں:

"وہ پوری توجہ اور دلچسپی سے اپنے منصبی فرائض انجام دیتا تھا اور بظاہر اس دفتری زندگی سے بلکل مطمئن تھا۔ لیکن اس کی ڈائریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی اذیت میں مبتلا تھا اور اسے اس بات کی شدید کوفت تھی کہ دفتری زندگی اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دے رہی ہے۔۔۔ کافکا کا خیال تھا کہ فرصت اور یکسوئی میسر ہو تو وہ کئی دن تک شبانہ روز مسلسل لکھ سکتا ہے۔ (۱)

یہی وجہ تھی کہ کافکا نے کچھ عرصہ ملازمت چھوڑ کر اپنے گھر سے دور ایک ویران جگہ پر رہنا شروع کر دیا اور اکثر تنہا رہنے کو ترجیح دیتا تھا اور تنہائی کا یہی شدید احساس اس کی تحریروں میں بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہی احساس کافکا کی کہانیوں میں وجودی لایعنیت کے احساس کو جنم دیتا ہے۔

۱۹۰۹ء میں کافکا کی چھوٹی موٹی تحریروں کی اشاعت شروع ہوئی لیکن کافکا نے بذات خود اپنی تحریروں کی اشاعت میں کبھی دلچسپی نہیں لی بلکہ اس نے اپنی بعض لکھی ہوئی تحریریں اپنے دوستوں سے بھی چھپا کر رکھی تھیں اور اپنی باقی کی کہانیوں کو جلا دینے کی تلقین کی تھی۔

کافکا کا پہلا نمائندہ افسانہ "فیصلہ" جو اس نے اپنی محبوبہ فراؤلین سے پہلی ملاقات کے بعد تحریر کیا، اور بعد ازاں کایا کلپ جیسے شہرہ آفاق افسانے تخلیق کیے۔ فراؤلین سے ملنے کے بعد کافکا نے کچھ عرصہ خوشگوار طریقے سے گزرا لیکن اسی دوران کافکا فراؤلین سے شادی کے حوالے سے تذبذب کا شکار رہا اور بالآخر منگنی توڑ دی۔ اس حوالے سے عاصم بٹ لکھتے ہیں:

"۱۹۱۳ء میں کے موسم بہار میں وہ اعصابی سکون کے لیے ویانا میں ایک پر سکون سینی ٹوریم میں داخل ہو گیا۔ اس نے وقتی طور پر باغبانی کا مشغلہ اپنا لیا۔ اس عرصے تک فراؤلین ایف بی

سے اس کے تعلقات مختلف نشیب و فراز سے گزر چکے تھے۔ وہ ۱۳ا اگست ۱۹۱۳ کو اپنی ڈائری میں لکھتا ہے "شاید اب یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ میں نے کل ہی فراؤلین کو خط میں لکھا ہے جو غالبا میرا آخری خط ہو گا۔ شاید یہی درست تھا۔ جو میرا کرب ہے اور جو اس کا کرب ہے، ان کے مقابلے میں وہ کرب ناقابل بیان ہو گا جو ان کے ملاپ سے پیدا ہو گا۔" اگلے روز وہ اپنی ڈائری میں مزید لکھتا ہے۔ "مجھے اس کے تین خط موصول ہوئے۔ میں اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔"[۲]

یہی وہ زمانہ تھا جب کافکا نے اپنی ملازمت کو خیر آباد کہہ کر خود کو ادب کے لئے وقف کر دیا، اس سارے وقت میں کافکا نے دیگر زبانوں کو سیکھنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ادب کا بے تحاشہ مطالعہ کیا لیکن اسی دوران چھڑ جانے والی پہلی جنگ، کافکا کی بیماری اور دیگر مسائل کی وجہ سے کافکا اپنا مکمل وقت ادبی مشاغل کو کبھی نہ دے سکا اور اس بات کا اعتراف بذات خود کافکا نے بھی کیا ہے۔

۱۹۳۲ء میں کافکا کی ملاقات ڈورا ڈائمنڈ سے ہوئی، اور کافکا نے اپنی زندگی کے لگے بندھے اصول کو توڑ کر اڈائمنڈ کو اپنی شریک حیات بنانے کا فیصلہ کیا، زندگی کا یہ عرصہ کافکا نے شدید بیماری کے باوجود برلن میں اڈائمنڈا کے ساتھ نہایت خوشگوار طریقے سے گزارا۔ اسی عرصے میں کافکا کی کہانیاں "ایک دیہاتی معالج،" فاقہ کش فن کار اور چند ایک ناولٹ منظر عام پر آئے۔ ۱۹۳۴ میں کافکا کی حالت تشویشناک صورتحال اختیار کر گئی تو کافکا اپنے والدین کے پاس واپس آ گیا، والدین کی دیکھ بھال اور علاج معالجے کے باوجود کافکا کی طبیعت میں کوئی بہتری نہیں آئی اور ۱۹۴۴ء کو کافکا وفات پا گیا۔

کافکا کے افسانوں میں اپنے عہد کی غیر یقینی صورتحال، عالمی جنگوں کے نتیجے میں ہونے والی معاشی، معاشرتی سیاسی اور سماجی صورتحال، قدروں کی شکست و ریخت، انسانی تعلقات کی سطحیت، فرد اور اس کے خارجی و باطنی مسائل اور الجھنوں کا مکمل بیان ملتا ہے۔ جو وجودیت کا اہم ترین نقطہ ہے۔ کافکا کے فن کی بات کی جائے تو کہانیوں کے کردار ایک مبہم اور خوابناک فضا کے زیر اثر خواب اور حقیقت کے درمیان سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناصر عباس نیرّ کافکا کے فن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شروع شروع میں کافکا کی تحریر خواب پریشاں کا تاثر دیتی ہے لیکن آخر آخر یہ خواب حقیقت بن جاتا ہے،اور مطالعہ ختم کر لینے کے بعد جب قاری اپنی مانوس دنیا میں واپس آتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک خواب پریشاں میں داخل ہو گیا ہے۔لیکن اس خواب پریشاں میں انتشار نہیں ہے بلکہ کسی مرموز نظام کے تحت اس میں سب کچھ ایک دوسرے سے مربوط ہے،ربط کا یہ احساس قاری کے دماغ میں ہلچل پیدا کر دیتا۔اور اس کو ہر چیز میں ایک نہایت مبہم مگر نہایت اہم قسم کی معنویت نظر آنے لگتی ہے۔یہ معنویت مذہبی سے لے کر جنسی تک ہو سکتی ہے۔کافکا کی کثیر التعداد تاویلوں کا یہی سبب ہے اور یہی کافکا کی انفرادیت ہے۔(۳)

ہمارے ہاں ادب میں اس مخصوص فضا کو کافکائی صورتحال کا نام دیا گیا ہے عاصم بٹ اپنے مضمون "اردو ادب پر کافکا کے اثرات" میں اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"انسانی فہم کو وہ نظر انداز شدہ نقطہ جس کی طرف کافکا نے ہماری توجہ دلائی اور جس میں خواب اور بیداری کی سرحدیں ایک دوسرے سے تحلیل ہو جاتی ہیں،اس کیفیت میں احساس گناہ ایک رنگ کا اضافہ کرتا ہے۔گناہ اور جرم انسانی شخصیت کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور اس سے کافکا کے فن کو بھی بنیاد ملتی ہے۔کیونکہ وہ انسان کے بنیادی احساس گناہ کو تصویر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ کافکائی رنگ ہے۔اس رنگ میں رنگے ہوئے کردار حیران کن روحانی اور جذباتی حتیٰ کہ جسمانی کرب اور تبدیلیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ان کا داخلی کرب ہی انہیں کافکائی کرداروں کے طور پر مخصوص کرتا ہے۔(۴)

کافکا کی وفات کے بعد عالمی سطح پر کافکا کی تحریروں کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی مختلف زبان میں کافکا کی تحریوں کے تراجم ہونا شروع ہوئے۔اردو ادب میں کافکا کی تحریروں کو پے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔اس سلسلے میں ناصر عباس نیرؔ کے اولین تراجم اور محمد عاصم بٹ کے تراجم بہترین مثال ہیں نہ صرف تراجم بلکہ کافکائی تحروں سے متاثر ہو کر بیشتر افسانہ نگاروں نے کافکائی رنگ میں افسانے لکھنا شروع کیے۔اس حوالے سے ناصر عباس نیرؔ لکھتے ہیں "نئے اردو افسانے پر بھی کافکا کا براہ راست یا بالواسطہ کافکا کا اثر پڑا ہے۔(۵)

اگر دیکھا جائے تو ان افسانہ نگاروں کی فہرست میں ناصر عباس نیئر، عاصم بٹ اور انتظار حسین کا نام سر فہرست نظر آتا ہے۔ ذیل میں انتظار حسین کے افسانوں پر کافکائی وجودیت کے اثرات کا جائزہ پیش کیا جائے گا اور دیکھا جائے گا انتظار حسین نے کافکائی اثرات کو اس حد تک قبول کیا اور دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں وجویت کے عناصر کس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔

## ب۔ انتظار حسین کے افسانوں پر کافکائی وجودیت کے اثرات

انتظار حسین کے افسانوں میں وجودی لایعنیت، کرداروں کا جذباتی، روحانی اور جسمانی کرب، خوابناک، ڈراؤنی اور دھندلی فضا کو کافکائیت کا نام دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انتظار حسین کی اکثر کہانیوں میں اندرونی سفر کی جہات مختلف وسیلوں سے روشن ہوتی ہیں ذہن میں یک بہ یک کوئی سوال پیدا ہو جاتا ہے، کوئی وہم سر اٹھاتا ہے، شک یا وسوسہ آگھیرتا ہے یا پرچھائیاں تیرتی ہیں یا ذہن دھند سے اٹ جاتا ہے، یا پھر ایک کے بعد ایک یادیں، تصویریں، واقعات کی کڑیاں، یا کیفیتوں کے نقوش ذہن میں بلبلوں کی طرح ابھرتے اور تحلیل ہوتے ہیں یہ سب سوچنے اور مسلسل سوچنے کا لازمہ ہے انتظار حسین کی اس آسیبی کیفیت یا پراسراریت کی طرح طرح سے توضیح کی گئی ہے اور بعض لوگوں نے دلچسپ نتائج نکالے ہیں خود انتظار حسین کے نزدیک سوچنا ایک ڈراؤنا عمل ہے جس میں وہ کافکا کے ہمسفر ہیں۔ (۶)

انتظار حسین بذات خود کافکا کے فن کے بہت بڑے متعرف تھے، اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کافکا سامنے کی چیزیں ٹھوس صورت میں پیش کرتا ہے مگر پیش کرنے کا عجب طور ہے کہ یہ سامنے کی چیز ایک رمز بن جاتی ہے اس کے ناول اور کہانیاں ایک نئے طرز کی طلسم ہوشربا ہیں، مگر ہماری افسانوی روایت ایک طلسم ہوشربا پہلے ہی تخلیق کر چکی ہے اب تو ہم اپنے عہد کی طلسم ہوشربا اسی صورت لکھ سکتے ہیں کہ پرانی طلسم ہوشربا اور نئی دونوں سے رشتہ جوڑیں۔ (۷)

خود انتظار حسین کی افسانوی فضا میں ہمیں یہی نیا طلسم ہوشربا نظر آتا۔ شمیم حنفی کے خیال میں "انتظار حسین کی پچاس برس کی یادوں پر مشتمل کتاب "چراغوں کا دھواں" لگ بھگ چار برس پہلے ۱۹۹۹ء میں سامنے آئی تھی۔ سب کا سب دیکھی بھالی باتوں کا لیکھا جوکھا۔ مگر اس روداد میں بھی ایک نئے "طلسم ہوش ربا" کی مہک شامل تھی۔

"انتظار حسین کوئی اخلاقی فیصلہ نافذ نہیں کرتے، کوئی بیان نہیں دیتے، تجزیہ نہیں کرتے، لیکن انسانی صورتحال کی دھوپ چھاؤں اور ہماری بگڑتی بکھرتی ہوئی دنیا کے اندھیرے اجالے کا ایک طلسم خود بخود اس طرح مرتب ہو جاتا ہے کہ ہم چور آنکھوں سے اپنے آپ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں اور اپنی دنیا اور زمانے کو بھی۔ (۸)

لیکن یہاں یہ کہنا غلط ہو گا کہ انتظار حسین نے اپنے افسانوں کی فضا میں کافکا کے اثرات کو ہو بہو قبول کیا ہے، بلکہ انتظار حسین نے مخصوص افسانوی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے کہانیوں میں مذہبی، اساطیری اور حکائتی انداز اپنایا ہے، اور اردو افسانے کو ایک الگ اور منفرد اسلوب سے متعارف کروایا، سہیل احمد کو انٹرویو دیتے ہوئے انتظار حسین اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جب میں نے "آخری آدمی" لکھا تھا تو اس سے پہلے میں کافکا کو پڑھ چکا تھا۔ آئی نیسکو کا پتا مجھے بعد میں چلا لیکن ایک بات میں عرض کروں کہ یہ مخلوق جسے بندر کہتے ہیں اور جو آخری آدمی میں نمودار ہوئی پتا نہیں کس طریقے سے میرے لئے شروع سے مسئلہ بنی رہی یہ مخلوق میرے خوابوں میں بھی آتی تھی اور مجھے ڈراتی تھی۔ ہماری بستی میں بھی بندر بہت ہوا کرتے تھے اور میں نے قرآن میں بھی ان کے متعلق ایک حکایت پڑھی تھی اور اس بستی کا ذکر پڑھا تھا جسے بندروں میں تبدیل کر دیا گیا، تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ سب کچھ میرے علم میں تھا۔ قرآن میں حکایت، کافکا کی کہانی اور اپنی بستی میں بندروں کے ساتھ تجربات اس کے بعد یکایک احساس ہوا کہ اب میں اس ملک میں ایسی صورتحال میں ہوں کہ مجھے بندروں سے، جو میرے خوابوں میں آتے تھے۔ نبٹنا ہے۔ تب وہ کہانی لکھی گئی۔ (۹)

اسی طرح ڈاکٹر سہیل احمد کے خیال میں:

"انتظار حسین نے کافکا صورتحال کو ہو بہو قبول نہیں کیا۔ اس نے موضوع کو اپنے تہذیبی ماضی اور اساطیر کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ انتظار حسین کا افسانہ آخری آدمی انسانوں کے

> بندر بن جانے کا تذکرہ کرنا ہے کافکا کی کہانی "قلب ماہیت" اور اس افسانے میں بنیادی فرق تہذیبی تناظر ہے۔اس کے ساتھ ساتھ "آخری آدمی" کا منظر نامہ جدید زندگی کا نہیں انسانوں کے رویے البتہ دائمی رویے ہیں جن کا جدید انسان بھی شکار ہے۔انتظار حسین کا دوسرا افسانہ "کایاکلپ" مدافعتی بہروپ کے مستقل ہو جانے کی داستان بیان کرتا ہے۔کافکا کی کہانی کا منظر نامہ جدید زندگی سے ماخوذ ہے۔(۱۰)

انتظار حسین کی کہانیوں میں لایعنی اور لاحاصل مشقت، عدم تحفظ، بے چہرگی اور خوف وہراس کی کیفیت کافکائی رنگ لئے ہوئے ہے۔کافکا کی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس غالب ہوتا ہے کہ انسان کہ اس دنیا میں آنے کے بعد شدید خواہش کہ باوجود گریز ممکن نہیں، نہ صرف کافکا کی کہانیوں میں بلکہ کافکا کی اپنی زندگی میں بھی یہ احساس شدت سے دکھائی دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کافکا نے اپنی زندگی میں ایک دو بار خودکشی کی کوشش بھی کی۔اسی طرح انتظار حسین کی کہانیوں آخری آدمی اور زرد کتا میں بھی یہی احساس ہمیں غالب نظر آتا ہے۔دونوں کہانیاں میں روحانی اور جسمانی سطح پر ہونے والی کشمکش مسلسل کرب کو جنم دیتی ہے جس سے چاہ کر بھی چھٹکارہ ممکن نہیں۔

کافکا کا افسانہ "کایاکلپ" اسی قبیل کا افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار کریگر ایک بڑے کیڑے کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اور اس غیر متوقع صورتحال میں وہ اپنے گھر والوں سے نہ صرف الگ ہو جاتا ہے بلکہ خاندان والوں کے رویوں میں بھی طرح طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ محبت، نفرت، غصہ، خوف، سراسیمگی، ہمدردی جیسے احساسات کہانی میں ایک عجیب فضا کو جنم دینے کا باعث بنتے ہیں۔ کریگر کا خوف، جسمانی اذیت، کرب اور تنہائی کا شدید احساس وجودی لایعنیت کو جنم دینے کا باعث ہے۔انتظار حسین کے افسانے آخری آدمی میں بھی بلکل اسی طرح کے احساسات ہمیں ابھرتے دکھائی دیتے ہیں جب بستی کے تمام انسان بندروں کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اس صورتحال میں الیاسف کا غصہ، ہمدردی، نفرت، محبت اور خوف کافکائی احساس پیدا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ "کایاکلپ" میں کریگر جس جسمانی تبدیلی اور اذیت سے گرزتا ہے، بلکلا سی طرح آخری اور کایاکلپ کے کردار جسمانی وروحانی تبدیلی کے مسلسل کرب اور خود کو موجودہ صورت حال سے نکالنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، لیکن ان کی تمام تر کوششیں لاحاصل ٹھہرتیں ہیں۔کافکا کے افسانے میں جسمانی تبدیلی اور ازیت و کرب کا یوں بیاں ملتا ہے:

"خود کو کمبل کے بوجھ سے آزاد کرنا بہت آسان تھا۔اس نے فقط اپنے جسم کو معمولی سا اوپر اٹھایا اور کمبل اپنے آپ ایک جانب نیچے گر گیا۔ لیکن اس عمل کو جاری رکھنا مشکل تھا خاص کر اس کے لیے کہ وہ غیر معمولی طور پر چوڑا تھا۔اسے خود کو اٹھانے کے لئے ہاتھوں اور بازوؤں کی ضرورت تھی۔ان کی بجائے اس کی بے شمار ننھی منھی ٹانگیں تھیں جو ایک تسلسل کے ساتھ مختلف طرح سے ہوا میں جھول رہی تھیں اور اس کے علاوہ یہ حرکت اس کے قابو سے باہر تھی اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو موڑنے کی کوشش کرتا تو کوئی دوسری مڑ جاتی اور اگر وہ اپنے اعضا کے ساتھ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس دوران باقی ٹانگیں جیسے ہر بندش سے آزاد ہو کر غیر معمولی کربناک احتجاج کے طور پر ہوا میں تڑپنے لگتیں۔"(۱۱)

افسانہ "آخری آدمی" میں اس صورتحال کا کچھ اس طرح سے بیان ملتا ہے:

"الیاسف نے اپنے اندر کے خوف پر غلبہ پایا اور اس کے سمٹے ہوئے اعضا کھلنے اور پھیلنے لگے ۔اس کے اعضا ڈھیلے پڑتے گئے اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے اور لجلجے ہو گئے اور اس کے جوڑ کھلنے لگے اور الیاسف کو گمان ہوا کے اس کے سارے اعضا بکھر جائیں گے تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کا بھینچا اور مٹھیاں کس کر بھاندھیں اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔"(۱۲)

اسی طرح انتظار حسین کا افسانے "زرد کتا" اور کایا کلپ" میں جان لیوا لایعنیت، کرب مسلسل، جبر، جسمانی اذیت کافکائت کا رنگ لیے ہوئے ہے انتظار حسین نے ان کہانیوں میں اپنے مخصوص تمثیلی، حکائیتی اور اساطیری انداز میں اندرون ذات اور بیرون ذات ہونے والے جان لیوا اذیتوں کو بیان کیا ہے۔

اسی طرح افسانہ "وہ جو کھو گئے" اور شہر افسوس کے کرادر" جو اپنی ذات کو کھو دینے کے ملال میں گم ہیں، دونوں افسانوں کی فضا میں موت کی کرختگی اور بے بسی کا بیان ملتا ہے بلکل اسی طرح کافکا کا افسانہ "شکاری کریگس میں یہی شک وخوف اور موت کی سراسیمگی کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے مثال کے طور پر شکاری گریگس میں:

"ایک لحاظ سے میں زندہ بھی ہوں۔ میرا موت کا جہاز راستہ بھٹک گیا۔ معلوم نہیں یہ چرخے کی غلط گردش تھی یا ناخدا کی ایک لمحے کی غفلت، یا خود میرے اپنے پیارے دیس کی طرف گھوم پڑنے کی خواہش، میں کہہ نہیں سکتا کیا بات تھی۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں دنیا

میں پڑا رہ گیا ہوں۔اوراس وقت سے اب تک میرا جہاز ارضی سمندروں کو کھنگال چکا ہے۔تو میں جس کو اپنے کوہساروں کے درمیان رہنے سے بڑھ کر کچھ پسند نہیں تھا، مرنے کے بعد سے دنیا کی تمام سرزمینوں کا سفر کرتا ہوں۔(۱۳)

انتظار حسین کے افسانے "شہر افسوس" میں اس صورتحال کا یوں بیان ملتا ہے:

"تو مرا نہیں ہے؟"ان دونوں نے اسے غور سے دیکھا"نہیں میں ابھی زندہ ہوں۔"

دونوں اسے تکنے لگے:"تو اپنے تیئں زندہ جانتا ہے؟"

ہاں میں زندہ ہوں مگر۔۔۔۔۔۔"

"مگر؟"دونوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"مگر میں لاپتہ ہوں۔"

"لاپتا؟"

ہاں لاپتہ، تمہیں معلوم ہے کہ اس قیامت میں بہت سے لوگ لاپتا ہو گئے ہیں۔"

"اور کیا تجھے یہ پتا ہے کہ "پہلا آدمی بولا:"جو لاپتہ ہوئے ہیں ان میں بہت سے قتل ہو چکے ہیں۔"

"مجھے یہ پتا ہے مگر میں مقتولوں میں سے نہیں ہوں۔"

"بہت سے اس طور مرے ہیں جیسے ہم مرے ہیں۔"

"میں تمہای طرح مرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔(۱۴)

افسانے میں شروع سے آخر تک موت کی سراسیمگی خوف ہراس اور ڈراؤنی فضا کو جنم دینے کا باعث ہے، پورے افسانے میں ہر کوئی اپنی جان بچانے کے لئے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے اور کسی جرم کی پاداش میں اپنے اپنے طور سزا بھگت رہا ہے جیسا کہ شکاری کریگس میں "میں ایک شکاری تھا۔اس میں کوئی گناہ تھا؟میری محنت کی داد ملتی تھی۔کالے جنگل کا عظیم شکاری میرا نام پڑ گیا تھا۔اس میں کوئی گناہ تھا۔؟(۱۵)

افسانہ ٹانگیں شہادت اور سوئیاں میں خوف بے چارگی کا احساس، تنہائی اور پچھتاوا کافکائیت کا عکس ہے۔افسانوں میں جرم و سزا اور خوف کے مناظر بلکل اسی طرح پیش کیے گئے ہیں جو کافکا نے اپنی کہانیوں میں بیان

کیے ہیں۔ کافکا کے افسانے "فیصلہ" میں بے چارگی، اذیت، تنہائی، احساس جرم اور کرب آگہی کے جس احساس کو قلمبند کیا گیا ہے وہی احساس ہمیں انتظار حسین کے افسانوں میں بھی نظر آتا ہے۔

انتظار حسین کے افسانے "کٹا ہوا ڈبہ" اور "ہمسفر" میں تنہائی، خوف، بے چینی، شش و پنج، قوت فیصلہ کی عدم موجودگی، پچھتاوا جیسے احساسات کافکائت کے انداز کو پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر "ہمسفر میں "وہ" کا کردار جو ایک غلط بس میں سوار ہو جاتا ہے، اور بارہا سوچتا ہے کہ اگلے سٹاپ پر اتر جائے گا لیکن لاکھ چاہنے کے باوجود وہ بس کو روک نہیں پاتا اور بس اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ اور اس کی واپسی کی تمام تر امیدیں دم توڑنے لگتی ہیں اور وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ آخر وہ جا کہاں رہا ہے:

> "کیوں بھئی واپس جانے والی بس ملے گی؟ ملے نہ ملے ایسا ہی ہے وقت تو ختم ہو گیا ہے؟ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ اسے خوف نے آلیا۔ اور پھر جب اگلے سٹاپ پر بس رکی تو اس نے ہم ہمی باندھی کہ ثقہ شخص کے پیچھے پیچھے وہ بھی اتر جائے اور وہاں کھڑے ہو کر واپس چلنے والی بس کا انتظار کرے، باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور عمارتیں درختوں کی طرح خاموش کھڑی تھیں اس نے جھجک کر سر اندر کر لیا۔[۱۶]

زندگی میں ایک بار غلط راستے یا فیصلے کا انتخاب زندگی کو بھول بھلیوں کی نذر کر دیتا ہے اور انسان ساری زندگی خود کو وقت اور حالات کے جبر سے چاہ کر بھی نکال نہیں پاتا۔ کافکا کے افسانوں کے کردار بند گلیوں اور بند راستوں میں بھٹکتے دکھائی دیتے ہیں۔ کافکا کی کہانی" میں زندگی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے دکھائی دیتے اور اس الجھاوے سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ کافکا کی کہانی "عدالت کی کھوج" میں اس صورتحال کا کچھ اسطرح سے بیان ملتا ہے:

> "آخر ایسا کیوں ہوا کہ میں نے دروازے پر درج ہدایات کو پڑھے بغیر عاقبت نااندیشی سے اس گھر میں گھس گیا اور فوراً ہی خود کو ان راہداریوں میں پایا اور وہاں اس جنون کے ساتھ بھٹک رہا ہوں کہ میرے لیے یاد رکھنا بھی ممکن نہیں ہے کہ میں بھی گھر کے سامنے کھڑا تھا، کبھی اس کی سڑھیاں چڑھا تھا۔ لیکن اب واپسی ممکن نہیں۔ نرا وقت کا ضیاع، ایک غلط جگہ چلے آنا میرے لیے ناقابل برداشت ہو گا۔ تو کیا؟ اس مختصر عجلت پسند زندگی میں، جو اس مضطرب شور کے ہمراہ ہے، کیا تم سڑھیاں اتر جاؤ گے۔؟ ناممکن۔[۱۷]

آدمی گرتا ہے اور سنبھلنے کی کوشش بھی کرتا ہے، لیکن لاکھ چاہنے کے باوجود اپنے آپ کو اس صورتحال سے نکال نہیں پاتا۔ وقت اور حالات کا یہ جبر اور پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا خوف انتظار حسین کا بنیادی محرک ہے۔انتظار حسین کے افسانے "اندھی گلی" چیلیں، اپنی آگ کی طرف، دیوار، وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے میں اسی طرز احساس کو بیان کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں لاحاصلی، تجسس، تحیر، نامعلوم کی جانب سفر، لاحاصل کی تھکن، اور بے بسی کی فضا ملتی ہے۔ مسافروں کے آگے اچانک لمبی ناعور ہونے والے دیواریں اور بند راستے آن کھڑے ہوتے ہیں جن کو پار کرنا ممکن نہیں، کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوتی۔

اسی طرح شہر افسوس اور وہ جو کھو گئے میں خوف وہراس، دہشت، بدحواسی، وسوسے، کی فضا کافکائی مزاج کو جنم دینے کا باعث ہے۔ دونوں افسانوں میں موت کی کرخت اور دردناک صورتحال لایعنی احساس پیدا کرتی ہے۔ "تب جھلسے چہرے خونم خوں وردی والا سپاہی مجمعے کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ گویا ہوا:

> "ایہاالناس! عرب کے بہادر بیٹے میدانوں میں سوتے ہیں۔ جو مارے گئے، نہ نسبت ان کے جو ذلیل ہوئے اور عرب کے بہادر بیٹے بلند و بالا کھجوروں کی مانند میدانوں میں پڑے ہیں، صحرا کی ہواؤں نے ان پر بین کیے، اور ارد گرد کی چادر میں ان کی تکفین کی۔[۱۸]

کافکا کے افسانوں میں میں ہمیں ایک مخصوص خوابناک فضا دکھائی دیتی ہے جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ کافکا کے افسانوں کے کردار خوابوں کے ذریعے حقیقت کا سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انتظار حسین کے ہاں ہمیں یہی فضا دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں تمام صورتحال کو بیان کرتے ہیں۔ افسانوں کے کردار خوابوں کے ذریعے حال سے ماضی تک کا سفر کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانے "سڑھیاں" اس حوالے سے بہترین مثال ہے۔ اندھیرا، نیند، خواب رات، ماضی کے دھندلکے، سڑھیاں، پرچھائیاں، خوف، دہشت جیسے الفاظ افسانے میں کافکائی رنگ پیدا کرتے ہیں۔

افسانہ "وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے" میں لایعنی اور لاحاصل مشقت اور جان لیوا اذیت کا احوال ملتا ہے۔ یہ ساری صورتحال جو افسانے میں بیان ہوئی ہے کافکا کے ناول "مقدمہ" میں بلکی اسی طرح لایعنی صورتحال کا ردعمل سامنے آتا ہے۔ قوم یاجوج ماجوج جو رات بھر دیوار چاٹتی ہے اس امید کے ساتھ کہ صبح وہ ایک نئی دنیا کے سفر پر چل نکلیں گے لیکن صبح ہوتے ہی وہی لمبی آہنی دیوار ان کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ وہ اس خیال سے شدید دہشت

اور اکتاہٹ کی زد میں آجاتے ہیں کہ دیوار چاٹنے کا لاحاصل عمل ازل سے ان کا مقدر ہے۔اور وہ تمام عمر یہی دیوار چاٹتے رہیں گے یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جائے گی۔موت کا احساس افسانے میں ایک عجیب وحشت بھری فضا کو جنم دیتا ہے:

"بوڑھے نے افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ "چاٹنا یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے، وہ سد سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے۔"(۱۹)

تحیر، لاحاصلی اور درد کی یہی فضا ہمیں انتظار حسین کے افسانے "دیوار میں بھی ملتی ہے۔کہانی کے کردار ایک بے معنی اور فضول قسم کے شوق کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔دیوار کی دوسری طرف کیا ہے یہ دیکھنے کے لیے تجسس میں مبتلا جو بھی دیور پر چڑھتا ہے ایک پر زور قہقہ لگاتے ہوئے دیوار کی دوسری جانب اتر جاتا ہے۔مندر یس کا کردار جس کا ایک دھڑ دیوار کے ایک طرف اور آدھا دھڑ دیوار کی دوسری طرف پڑا ہے کہانی میں حیرت ودہشت ک عجیب ڈراؤنی ی فضا کو جنم دینے کا باعث ہے۔کافکا کے ہاں بھی ہمیں یہی دہشت بھری اور بھید بھری فضا ملتی ہے۔جس کا تعلق جانی پہچانی دنیا سے تو ہوتا ہے لیکن کہانی میں موجود صورتحال ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جس کے اندر بہت سارے اسرار اور رموز چھپے ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ کافکا کی کہانیوں میں جدید دور کے انسان کا لالچ، ہوس، منافقت ایسے رویے بلکل ویسے ہیں جن کا اظہار انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں کیا کیا ہے۔فرد اور خاندانی رشتوں کا تضاد، اجنبیت، بیگانگی، ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے اایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جانا دجیسی کیفیات دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں مشترک ہیں۔

# حوالہ جات


۱۔ نیرّ مسعود، کافکا کے افسانے، ادبستان دین دیال روڈ، لکھنؤ، ۱۹۷۹ء، ص ۹

۲۔ عاصم بٹ، کافکا کہانیاں، ص ۷۔۸

۳ نیرّ مسعود، کافکا کے افسانے، ادبستان دین دیال روڈ، لکھنؤ، ۱۹۷۹ء ص ۱۵، ۱۴

۴۔ عاصم بٹ، اردو ادب پر کافکا کے اثرات

۵۔ نیرّ مسعود، کافکا کے افسانے، ادبستان دین دیال روڈ لکھنؤ، ۱۹۷۹ء ص ۱۱

۶۔ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵

۷۔ شمیم حنفی، انتظار حسین ایک ادھوری تصویر، مشمولہ، ہم سفروں کے درمیاں، انجمن ترقی اردو ہند،، نئ دہلی، ۲۰۰۵، ص ۲۵

۸۔ ایضاً، ص ۲۵

۹۔ سہیل احمد، طرزیں، قوسین، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۷

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ کافکا کہانیاں، مترجم عاصم بٹ، ص ۵۷

۱۲۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،

۱۳۔ نیرّ مسعود، کافکا کے افسانے، ادبستان دین دیال روڈ لکھنؤ، ۱۹۷۹، ص ۲۲

۱۴۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۵۔ نیرّ مسعود، کافکا کے افسانے، ادبستان دین دیال روڈ لکھنو، قق ۱۹۷۹ء

۱۶۔ انتظار حسین، آخری آدمی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۷۔ کافکا، کی کہانیاں، مترجم عاصم بٹ

۱۸۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۔ ایضاً

## باب پنجم:

# ماحصل

## الف۔ مجموعی جائزہ

وجودی فلسفے کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہی ہے کہ اس فلسفے کا بنیادی مرکز محور انسانی ذات ہے۔ تمام وجودی مفکر گھوم پھر کر ایک ہی بنیادی اساسی نقطے پر آ ٹھہرتے ہیں۔ وجودیت عصر حاضر کا ایک ایسا فلسفہ ہے جس نے سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی سطح پر زوال کے شکار انسان کو اپنے موضوع کی جانب رجوع کرنے پر اکسایا۔ فرد جو اپنے وجود کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں الجھن کا شکار تھا اور معروض سے اکتا کر منفیت کا شکار ہو چکا تھا۔ ایسے لمحے میں فرد کے ذہن و دل میں بے شمار قسم کے سوالات سر اٹھاتے ہیں کہ انسان کی اس دنیا میں اصل حقیقت کیا ہے؟ کیا انسان اس دنیا میں محض سزا جھیلنے آیا ہے۔؟ انسان کی ذاتی حیثیت کیا ہے؟ یہاں وجودیت فرد کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ فرد اس کائنات میں افضل و برتر ہے۔ فرد اپنی ذات پر کامل یقین رکھتے ہوئے شکست تسلیم کرنے کی بجائے حالات و واقعات کا ڈٹ کر مقابلہ کرے تو وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کے لئے زندگی کے درست اور مثبت دھارے تلاش کر سکتا ہے۔

دیکھا جائے تو پہلی اور دوسری جنگ عظیم اور پھر سائنسی انقلاب کے بعد وجودی فلسفے نے جہاں مغرب میں ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا وہیں اس فلسفے نے مشرق میں بھی اپنے انمٹ نقوش مرتب کیے۔ بیسویں صدی میں برصغیر پاک و ہند میں ہونے والے سیاسی انتشار اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ مسائل نے فرد کو اپنے من کی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ غلامی، موت، ذلت،، اہانت، غربت، افلاس، اخلاقی زوال یہ وہ تمام عوامل تھے جو مشرق میں وجودی فکر کو پروان چڑھانے کا باعث بنے۔

اس سے پہلے اگر دیکھا جائے تو انیسویں صدی میں میں برصغیر پاک و ہند میں بلکل وہی صورتحال موجود رہی جو انیسویں صدی میں موجود تھی، دلی پر جاٹوں اور مرہٹوں کے پے در پے حملے، حکومت برطانیہ کی ہندوستان آمد اور پھر نوآبادیاتی نظام، ہندو مسلم تضادات، ذات پات کی تقسیم اور دیگر آزادی کے لیے لڑی جانے والی جنگوں اور

سیاسی تحریکوں نے ہندوستان بھر میں نہ صرف بیرونی بلکہ داخلی سطح پر انتشار وافتراق بے سمتی اور بے چینی کی فضا پھیلادی۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ ہر عہد میں تخلیق ہونے والا ادب اس عہد کے حالات و واقعات کا مکمل عکاس ہوتا ہے۔ لہذا ہمارے ادیبوں، فلسفیوں اور شاعروں نے اس عہد میں پیدا ہونے والے حالات وقعات اور فرد کے داخلی جذبات واحساسات کو اپنا موضوع بنایا۔ جیسا کہ دلی کے اجڑنے کے بعد میر تقی میرؔ، میر دردؔ، سوداؔ اور دیگر ہم عصر شاعروں نے فرد کے داخلی احساسات کو شاعری میں پیش کیا۔ اسی طرح اقبال کے افکار و خیالات وجودی فلسفے کے انتہائی قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ خودی جو انکی شاعری کا بنیادی نقطہ ہے وجودی فلسفے کی تفہیم کرتا ہے۔

اقبال کے نزدیک، انسانی ذات، اس کا وقار، اسکی انا اور عظمت ہی سب کچھ ہے، اور اس کے لیے اقبال نے شرط رکھی ہے کہ انسان سب سے پہلے خود کا پہچانے،، اپنی ذات کا عرفان ہی اانسانیت کے اعلی مقام تک پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح نثری ادب میں خصوصا اردو افسانہ نگاروں کے ہاں وجودیت کے چند عناصر ضرور مل جاتے ہیں جن سے وجودی فلسفے کی تفہیم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے پریم چند، منٹو عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی کی کہانیاں بہترین مثال ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں کرداروں کا داخلی کرب، اضطراب، شدید قسم کا احساس گناہ، اور خلفشار وجودی فکر سے مملو ہے۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں موضوعیت پسندی کی روایت انیسویں صدی سے چلی آرہی ہے لیکن اس کا باقاعدہ طور پر آغاز ۱۹۶۰ء کے بعد ہمارے ادب میں ناول، افسانہ اور شاعری میں ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ قیام پاکستان،، ہجرت اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے عوامل، ۱۹۶۵ کی جنگ، سقوط ڈھاکہ اور مارشل لاء نے سیاسی اور معاشرتی عدم واستحکام کی ایسی فضا پیدا کر دی کہ ہر شخص خارج سے اکتا کر اپنے من کی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ اب یہاں ہم دیکھتے ہیں کے اس ساری صورتحال میں دو طرح کے قنوطی اور رجائی رویوں کو اپنایا گیا۔ موت کی ناگہانیت، ذہنی غلامی سیاسی انتشار، قتل وغارت اخلاقی اور تہذیبی زوال نے فرد کا انسانیت پر سے اعتماد چھین لیا۔ فرد داخلی سطح پر شدید ہیجان کا شکار ہوا۔ انسانی زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی۔ جہاں موت کی ناگہانیت نے فرد کو زندگی کے بے ثبات ہونے کا احساس دلایا وہیں فرد کے نزدیک زندگی کی قدر و قیمت بڑھی۔ زندگی سے وابستگی کے شدید احساس کے زیر اثر فرد زیادہ جوش اور جذبے کے تحت اپنے بقا کے لئے جنگ لڑنے لگا۔

ایسے میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے موضوعیت پسندی کے رجحان کو ناول، شاعری اور افسانے کا موضوع بنایا۔ ان افسانہ نگاروں کی فہرست میں بہت سے نام ایسے ہیں جنھوں نے نہ صرف خود وجودی فکر کے حامل افسانے تخلیق کئے بلکہ مغربی افسانہ نگاروں کی کہانیوں کے تراجم بھی کئے۔ یوں ان افسانہ نگاروں کے توسط سے اردو ادب میں میں وجودی افکار و نظریات با قاعدہ طور پر پروان چڑھے۔ انتظار حسین کی بات کی جائے تو وہ مغربی افسانہ نگاروں سے متاثر ضرور تھے لیکن مغربی ہیئتوں کو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مشرقی رنگ میں ڈھال کر اردو افسانے کو ایک منفرد اسلوب پیش کیا۔ نتظار حسین نے اس عہد میں میں ہندوستان کی مخصوص اساطیری فضا اور تصوف کی تعلیمات کی روشنی میں موضوعیت پسندی کے رجحانات کو افسانے کا موضوع بنایا۔ یوں انتظار حسین نے اردو افسانے کو فنی اعتبار سے اوج کمال بخشا۔

انتظار حسین کے افسانوں میں تشکیک اجنبیت، بیگانگی کرب، اضطراب زندگی کی لایعنیت، تنہائی موت کا خوف، احساس جرم وغیرہ، وغیرہ ایسے امور ہیں جو بار بار دہرائے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کھوئے ہوئیوں کی جستجو، ذات کی تلاش اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ہی ذات کی نفی، اور لایعنی رویے مرکزی تصورات ہیں۔ ان کے تمام افسانے زندگی اور اس کے المیوں سے پیدا شدہ خلا سے سروکار ہیں اس طرح کہ فرد اپنے لیے خوشی اور مسرت کی راہ تلاش کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اگلے ہی لمحے خوشی و مسرت اڑن چھو ہا جاتی ہے ار و فرد ماضی و حال کے ایک لایعنی خلا میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

چونکہ ان کے افسانوں میں ہجرت کے المیے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ افسانوں کے کردار ماضی کی بھول بھلیوں اور خوابوں میں بھٹکتے ہوئے اپنی ہی ذات کے ٹکڑے اکٹھے کرنے میں مگن ہیں، اور بسا اوقات ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں۔

انتظار حسین کے افسانوں میں رجائی پہلوؤں کی بات کی جائے تو انتظار حسین کی کہانیوں میں انسانی زندگی کے ان تمام مسائل کا بیاں ہے جس سے موجودہ عہد کا انسان نبرد آزما ہے۔ افسانوں کے کردار پر امید بھی ہیں، پر جوش ہیں آزادی کے خواہش مند بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی زندگی کی ناگہانیت کے آگے بے بس و لاچار بھی ہیں۔ ٹوٹے ہوئے خواب، ٹوٹی ہوئی خواہشیں، اندھیرے اور دھند لکے جس میں کردار اپنے لیے تھوڑی سے روشنی اور آزادی کے لیے جد وجہد کرتا ضرور دکھائی دیتا ہے۔ لہذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انتظار حسین کے ہاں رجائی

پہلو سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ افسانوں میں مثبت عناصر اس طرح موجود ہیں کہ ان کی تفہیم قدرے مشکل ہو جاتی ہے۔ باب سوم میں انتظار حسین کے افسانوں میں موجودی وجودیت کے چند ایک مثبت عناصر کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جن میں خود شناسی، خود آگہی، تصور آزادی جوش عمل اور جدوجہد شامل ہیں۔ جہاں افسانوں کے کرادار خوش حالی، جسمانی آسائشوں آنے والے روشن مستقبل کے حوالے سے پر امید بھی نظر آتے ہیں اور پر جوش بھی لیکن ساتھ ہی زندگی کی کثافتوں اور لعنتوں سے خائف بی ہیں۔

باب چہارم میں انتظار حسین کے افسانوں پر کافکائی وجودی اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں میں زندگی کی لائعنیت، اکتاہٹ، مایوسی اور کرب ایسے عناصر ہیں جن کا اظہار ہمیں کافکا کے ہاں ملتا ہے۔ ان افسانوں کی جادوئی فضا میں کافکائی اثرات کی رمق ملتی ہے۔ انتظار حسین کافکا کے اسلوب سے متاثر تھے اور اس بات کا اظہار وہ خود بھی کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انتظار حسین کے افسانوں پر کافکائی وجودیت کے اثرات موجود ضرور ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انتظار حسین نے اپنے مخصوص اساطیری، مذہبی، داستانوی اسلوب کی بنا پر اردو افسانے کو نت نئے تجربات سے روشناس کروایا۔

## ب۔ نتائج تحقیق

انتظار حسین کے افسانوں میں وجودی عناصر کے تحقیقی و تنقیدی مطالعے کے بعد درج ذیل تحقیقی نتائج سامنے آئے ہیں:۔

ا ۔ وجودی فلسفے کی تفہیم کرتے ہوئے صرف ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ وجودی فلسفہ صرف ایک ہی بنیادی اساسی نقطے "انسانی ذات" پر قائم ہے۔ تمام وجودی مغربی و مشرقی فلاسفر انسانی آزادی کی بات کرتے ہیں۔ ان تمام کے نزدیک انسان معاشرے میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہے۔ انسان اپنی مرضی سے اپنے لیے غلط اور صحیح کا انتخاب کر سکتا ہے۔

۲۔ انتظار حسین کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اردو افسانے کو فطری اور فنی سطح پر نئے و پرانے امکانات سے روشناس کروایا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جدید ہیئتوں کے ساتھ ساتھ قدیم سانچوں اور اظہار کی صورتوں کو اپنایا ہے۔ انہوں نے اردو افسانے کا رشتہ قدیم داستانوں، اساطیری روایتوں اور حکایتوں سے جوڑ کر فہم و ادراک کی نئی راہیں کھول دی۔ ان کے ہاں قدامت اور جدت دونوں کی آمیزش موجود ہے

۔ان کے افسانوں میں زندگی اور زندگی سے وابستہ تمام مسائل، فرد کی الجھنیں چاہے چاہے وہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر کا بیان مکمل طور پر ملتا ہے۔

۳۔ چونکہ انتظار حسین کے افسانوں میں اپنے عہد کے تمام داخلی وخارجی مسائل، نفسیاتی الجھنوں، بامعنی اضطراب اور کشمکش کا مکمل بیان ہے۔یہی وہ تمام عوامل ہیں جو ایک افسانہ نگار کی تخلیقی سوچ کو پروان چڑھانے اور اسے وجودی افسانہ نگار بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

۴۔ انتظار حسین کے افسانوں میں تنہائی، مایوسی، اکتاہٹ اور زندگی کی لایعنیت ایسے عوامل ہیں جن سے انتظار حسین کافکا کے خوشہ چین معلوم ہوتے ہیں۔

## ج۔ سفارشات

ا۔ انتظار حسین کے افسانوں کا مذہبی اور اساطیری روایت کے پس منظر پر ایک الگ تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ انتظار حسین کے افسانوں کا وجودی نقطہ نظر کے حوالے سے امغربی افسانہ نگاروں کے ساتھ تقابل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً چیخوف اور کافکا کے افسانے۔

۳۔ انتظار حسین کے افسانوں میں علامتی، اساطیری اور دیومالائی عناصر کی نشاندہی اور تجزیہ ایک اچھا تحقیقی موضوع ثابت ہو سکتا ہے۔

۴۔ انتظار حسین کے افسانوں پر موضوعاتی اور اسلوبیاتی حوالے سے بھی تحقیقی کام ممکن ہے۔

۵۔ انتظار حسین کے ناولوں میں موجود وجودی عناصر کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

# کتابیات


## بنیادی ماخذ

مجموعہ انتظار حسین، انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

## ثانوی ماخذ

بختیار حسین صدیقی، پروفیسر، "وجودیت کیا ہے "مشمولہ وجودیت "مرتبہ جاوید اقبال ندیم، وکٹری بک بینک ساہیوال ۱۹۸۹ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء

حسن عسکری، مجموعہ عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، مترجم قاضی جاوید، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

سلیم اختر، ڈاکٹر، وجودیت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء

سلیم آغا، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجم ترقی اردو پاکستان

سہیل احمد، طرزیں، قوسین، لاہور، ۱۹۸۹ء

شمیم حنفی، ہم سفروں کے درمیاں، انجمن ترقی اردو ہند،، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء

عاصم بٹ، کافکا کہانیاں۔

علی عباس جلال پوری،، روایات فلسفہ۔ منظور پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۹۲ء

قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۰ء

گوپی چند نارنگ، پروفیسر، اردو افسانہ روایت اور مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

نیئر مسعود، کافکا کے افسانے، ادبستان دین دیال روڈ، لکھنؤ، ۱۹۷۹ء

## رسائل

فکر و نظر، اسلام آباد، جلد ۴۷، شمارہ ۳

## لغات

علمی اردو لغت (جامع) وارث سرہندی (ایم۔اے)، علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور

قائد اللغات، مؤلفہ ابو نعیم عبد الحکیم خان نشتر جالندھری، حامد اینڈ کمپنی، مدینہ منزل، اردو بازار، لاہور

## انگریزی کتب

Existentialism A very short introduction by Thomas Flynn,
Oxford University
Existentialism and Religious belief by David E. Roberts
Irrational man by William Barret
Six existentialism thinker by Harold john Blackham
The Concept of anxiety, Soren Kierkegaard, in Edit and Translated by Reidar Thomte

**ویب گاہیں (انٹرنیٹ)**

http://www.mukaalma.com

**مقالہ جات**

افتخار بیگ، اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد،

**انٹرویو**

سلیم اختر، ڈاکٹر، تحریری انٹرویو، از شاہین مفتی، مطبوعہ ادبیات پاکستان جنوری ۱۹۹۵ء